

سورج خورشید

کاشمیر

ڈاٹ کام



141	☆ باب 17: محبت کے تین پہر
147	☆ باب 18: محبت اور خدا
158	☆ باب 19: ہالوکاسٹ
163	☆ باب 20: سنگ دل
171	☆ باب 21: ٹرم پیپر
176	☆ باب 22: پھرو ہی نظر
187	☆ باب 23: جیوری کا فیصلہ
193	☆ باب 24: بے خودی
210	☆ باب 25: جاوگر
215	☆ باب 26: دشمن خدائی
228	☆ باب 27: یہودی بستی
236	☆ باب 28: وہ اک ملاقات
277	☆ باب 29: یادوں کی بارات
282	☆ باب 30: خوف
287	☆ باب 31: گریز محبت
304	☆ باب 32: پہلی بازی
322	☆ باب 33: نوجوان انقلاب
329	☆ باب 34: چلتے چلتے
347	☆ باب 35: الوداع
354	☆ باب 36: تجدید ایمان
363	☆ باب 37: کبھی الوداع نہ کہنا

☆☆☆

فہرست

☆	☆ پیش لفظ..... ہاشم ندیم	8
☆ باب 1:	☆ پہلی بارش	9
☆ باب 2:	☆ پھرو ہی شام	14
☆ باب 3:	☆ محبت:..... نیلا موسم	18
☆ باب 4:	☆ پھرو ہی محبت	23
☆ باب 5:	☆ لندن اُداس ہے	31
☆ باب 6:	☆ ایمان	40
☆ باب 7:	☆ یہودی	50
☆ باب 8:	☆ گھائل	57
☆ باب 9:	☆ پہلی کلاس	71
☆ باب 10:	☆ زہر عشق	76
☆ باب 11:	☆ زرد لندن	92
☆ باب 12:	☆ محبت کی دو پہر	99
☆ باب 13:	☆ یادیں	106
☆ باب 14:	☆ محبت ناقص	111
☆ باب 15:	☆ نیند	123
☆ باب 16:	☆ خدا اور محبت	129

پہلی بارش

وہ شاید ہوائی جہاز کے پہیوں کی رن وے سے رگڑ کھانے کی آواز تھی جس سے میری کچی نیند ٹوٹ گئی تھی۔ جہاز لندن کے ہیتھرو ایئر پورٹ پر لینڈ کر چکا تھا اور اب دھیرے دھیرے رن وے پر چلتا ہوا پارکنگ ایریا کی جانب بڑھ رہا تھا ایئر ہسٹس کے اعلان کے مطابق لندن کا مقامی وقت صبح چھ بجے کا تھا۔

لندن شہر ایک ملگجھے سے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا رات بھر بارش ہوتی رہی ہے، ہلکی ہلکی سی پُھو ارب بھی میری سیٹ کی ونڈ اسکرین پر ارتعاش بکھیر رہی تھی، یہ بارشیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں، کبھی تو ساری عمر بھی موسلا دھار برستی رہیں تب بھی انسان کا اندر بھگو نہیں پاتیں۔۔۔۔ اور کبھی کسی کے من کو ہر لمحہ جل تھل کیے رکھتی ہیں، لیکن باہر والوں کو اس کی خبر بھی نہیں ہو پاتی۔۔۔ لندن کی یہ پہلی بارش بھی کچھ ایسی ہی تھی جس نے میرے وجود کو تو باہر سے بھگو دیا لیکن میرے اندر کی پیاس اب بھی میرے حلق میں کانٹے چھو رہی تھی۔

جہاز اپنے مقررہ پارکنگ اسٹینڈ پر لگی ٹیوب سے جڑ چکا تھا اور مسافر جمائیاں لیتے ہوئے ایک ایک کر کے ٹیوب کے ذریعے ٹرمینل پر اتر رہے تھے۔ جب تک میں لاؤنج میں پہنچا تب تک افق سے صبح کی ہلکی سی سفیدی جھانکنے لگی تھی، لیکن کالے گھنے بادلوں اور مسلسل بوند باندی کی وجہ سے لاؤنج کی شیشے کی دیوار کے باہر اب بھی کسی اداس شام کا سا زردی مائل پیلا اندھیرا باقی تھا۔

میں، حماد امجد، پاکستان کے معروف تاجر خاندان کا چشم و چراغ کہ جس کے آباؤ اجداد پاکستان بننے سے پہلے اور پاکستان بننے کے بعد بھی، انتہائی اہم حکومتی عہدوں پر فائز

پیش لفظ

سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ محبت کو آپ جی کیوں کہتے ہیں۔ محبت تو جگ جتی ہے۔ دنیا کا وہ کون سا فرد ہے جو اس تجربے سے نہیں گزرا ہوگا؟ شرط صرف تسلیم کرنے کے سچ یا انکار کرنے کی منافقت کی ہے۔ میں نے محبت اور مذہب کو جس طرح خود پر وارم ہوتا محسوس کیا، اُسے ان صفحات پر لفظوں کی صورت میں بکھیر دیا۔ محبت اور مذہب کی جنگ تو میرے دل نے لڑی اور میری روح نے جھیلی ہے، لیکن جیت مذہب کی ہوئی یا محبت کی۔۔۔۔ اس کا فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔ مقصد محبت یا مذہب میں سے کسی بھی ایک کی برتری ثابت کرنا تبھی نہیں رہا۔ بس کچھ سوال جواب چاہتے تھے۔ لیکن مذہب اور محبت کی اس ٹکرائل میں کچھ نئے سوال جنم لیتے نظر آ رہے ہیں۔ سو میری گزارش ہے کہ اس کتاب کو صرف وہی لوگ پڑھیں جو زندگی میں نئے سوالوں کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ جواب البتہ فرض نہیں ہے۔

ہاشم ندیم

۱۵۵۵
۱۴۱۱

میں نے یہیں بیٹھ کر کامران کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ہوا میں برف کے گالوں کی آمیزش بڑھ رہی تھی اور جب تک میں اپنے منتخب کردہ بیچ تک پہنچا تب تک باقاعدہ برف باری شروع ہو چکی تھی۔ مجھے یاد ہے بچپن میں، میں اور کامران شام کو آسمان پر برف کے مخصوص دودھیا سفید بادل دیکھ کر رات بھر اپنے اپنے گھر میں بستروں میں دبکے، برف گرنے کی دعائیں کیا کرتے تھے اور صبح جب آسمان سے برف کے ستارے گرتے دیکھتے اور شہر کو برف کی سفید چادر میں لپٹا دیکھتے تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہتا۔ گھر والے ہمیں ڈھونڈتے ہی رہ جاتے اور ہم کہیں دور آتے جاتے راہ گیروں پر چھپ کر برف کے گولے برسانے میں مصروف رہتے۔ سوچتا ہوں بچپن کا وہ دمبہر اتنی جلدی کیوں بیت جاتا ہے اور جوانی کی یہ کڑی دھوپ ہے کہ جیسے صدیوں سے سر پر تنی ہوئی ہے اک ذرا بھی سرکتی نہیں۔

میں جس جگہ بیٹھا ہوا تھا زمین کا وہ ٹکڑا عام سطح سے کچھ بلند تھا اس لیے دور سے لندن شہر کی اونچی لیکن قدیم عمارتوں کی جھلک یہاں سے واضح نظر آ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں برف نے تمام شہر کو پوری طرح سے ڈھک لیا۔ خود مجھے بھی دور سے کوئی دیکھتا تو شاید برف سے بنا اک مجسمہ ہی سمجھتا۔ کامران کا ابھی تک کچھ اتہ پتہ نہیں تھا، وہ بچپن سے ہی ایسا تھا۔ ہمیشہ کا لاپرواہ، اور صبح جلدی اٹھنے سے تو ہم دونوں کی جیسے جان ہی جاتی تھی۔ مجھے یاد ہے، ہم دونوں سالانہ امتحانات میں بھی بمشکل پرچے بننے کے بعد ہی کلاس روم میں پہنچتے تھے۔ بچپن یونہی ہنستے کھیلتے گزر گیا لیکن پھر اچانک کامران کے گھریلو حالات نے پلٹا کھایا، ماں باپ ایک ٹریفک حادثے میں اللہ کو پیارے ہو گئے، گھر میں کامران اکیلا رہ گیا کیونکہ اس کی اکلوتی بڑی بہن پہلے ہی بیاہ کر اپنے گھر سدھار چکی تھی۔ باپ کی بھوت کے بعد کامران کو پتہ چلا کہ اس کے باپ نے قرضوں کا بے تحاشا بوجھ اس کے لیے ورثے میں چھوڑ رکھا ہے۔ قرض خواہوں کے مطالبات بڑھتے گئے اور آخر کار اسے مجبوراً اپنا آبائی گھر اور بچی کھچی جائیداد بیچ کر لندن شفٹ ہونا پڑا۔ قرض چکانے کے بعد جو کچھ بچا اس نے کامران نے یہاں ایک چھوٹا سا ریستورنٹ کھول لیا تھا اور اب اس کی گزر بسر مناسب انداز سے ہو جاتی تھی۔ اور اب تو وہ مکمل اسی شہر کا ہو کر رہ گیا تھا۔ دراصل اسے لندن ہمیشہ سے ہی بہت پسند

رہ چکے تھے۔ تجارت جس کے گھر کی باندی ہے اور ملک کے اہم سرکاری عمارت جس کے گھر شام کی چائے پر طلب کیا جانا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ وہ حماد امجد آج لندن کی اس بھیگتی صبح میں تنہا اور اس ہتھروائر پورٹ کے آمد لاؤنج میں کھڑا تھا، کہنے کو تو میری لندن آمد کا مقصد یہاں کی مشہور کنگسٹن (Kingstone) یونیورسٹی کے شعبہ معاشیات سے اعلیٰ تعلیم کی دو سالہ ڈگری لینا تھا، لیکن میں خود جانتا تھا کہ یہ صرف ایک بہانہ تھا، خود اپنی ذات سے فرار ڈھونڈنے کا ایک بہانہ۔ میں خود کو اس شہر کی گہما گہمی میں اس قدر ملوث کر دینا چاہتا تھا کہ مجھے پل بھر بھی خود اپنے آپ کے ساتھ تنہا گزارنے کا موقع نہ مل پائے۔ میری ذہنی حالت ایسی تھی کہ میں دوسروں کے ناگوار وجود کو بھی جھیلنے کے لیے تیار تھا لیکن خود اپنا سا منالے بھر کو بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ انسان بھی کتنا مجبور اور لاچار ہے۔ باہر آس پاس لگے بھی آئینے پھوڑ بھی ڈالے تب بھی اپنے اندر لگے آئینے کا سامنا ہر دم لازمی ہوتا ہے۔

جب تک میں کسٹم اور دیگر معمول کی کارروائی سے فارغ ہو کر ٹریمنل سے باہر پہنچا تب تک باہر کی خنک ہوا میں برف کے اکا دکا ستارہ نما گالے شامل ہو چکے تھے۔ کھلی فضا میں پہلا قدم رکھتے ہی سردی کی ایک شدید لہر نے میرے سارے وجود کو جھنجھنا سا دیا۔ بے اختیار میرے ہاتھ میرے اور کوٹ کے کالر کی طرف بڑھ گئے اور میں نے خود کو اچھی طرح سے ڈھانپ لیا۔ سردی چاہے جتنی بھی شدید کیوں نہ ہو، اس کی پہلی لہر آپ کے اندر تازگی کا ایک احساس ضرور بیدار کر دیتی ہے۔ اس ٹھنڈے ہوا کے پہلے جھونکے نے میرے اندر بھی تمام احساسات کو جگا سا دیا تھا۔ میں نے اپنے بچپن کے لنگو پیے دوست کامران کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن میری توقع کے مطابق اس کا دور دور تک کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔

پہلے تو جی میں آیا کہ سامنے پارکنگ اسٹینڈ میں کمزری ٹیکسی لے کر خود ہی اس کے فلیٹ پر پہنچ جاؤں۔ میں لندن پہلے بھی کئی مرتبہ آچکا تھا اور اس شہر کے درود یوار میرے لیے کبھی اجنبی نہیں رہے تھے۔ لیکن پھر جانے کیا سوچ کر میں ایئر پورٹ ٹریمنل سے اپنا اکلوتا سوٹ کیس گھسینتا، درمٹنگ گھاس کے ایک بڑے سے دریاں قلعے کی طرف بڑھ گیا، جہاں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر لگائے گئے لکڑی کے خوبصورت پتھروں کی ایک قطاری موجود تھی۔

کچھ دیر ہو گئی۔ لیکن تم باہر اس برف باری میں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ ہمیں نے وہاں سارا ٹریٹل چھان مارا تمہاری تلاش میں۔“

میری کامران سے پورے دو سال بعد یہ پہلی ملاقات تھی۔ دو سال پہلے وہ یہیں لندن کے اسی ہتھرووائیر پورٹ پر مجھے آخری مرتبہ الوداع کہنے آیا تھا۔ تب زندگی کتنی حسین تھی۔ تب میں لندن صرف آوارہ گردی کرنے اور کامران کی بے ٹکان بکواس سننے کے لیے آتا تھا۔ بچپن کے سچے دوست بھی کسی گھنے، سایہ دار شجر کی طرح ہوتے ہیں، ان کی چھاؤں میں کتنا سکون، کتنا آرام ہوتا ہے، بل بھر کو نہیں بھی کامران کے گلے لگ کر اپنے جلتے زخموں کو بھول سا گیا تھا۔

دفعۃً اُس نے مجھے اپنے آپ سے جدا کیا اور غور سے دیکھ کر کہنے لگا ”یار میڈی، تم کتنے کمزور لگ رہے ہو۔“ میں نے اپنے سوٹ کیس کا ہینڈل اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”کاش میں بھی تمہارے لیے کوئی اسی قسم کی رائے دے سکتا۔“ کامران ہنس کر ڈھٹائی سے بولا۔ ارے یار، تم تو جانتے ہونا، بچپن سے ہی مجھ پر کھانا ذرا جلدی لگتا ہے۔ اچھا اب یہیں کھڑے رہ کر فریز ہونے کا ارادہ ہے کیا؟ گھر چلو۔ کامران نے قدم آگے بڑھا دیے۔ ساتھ والے بیچ پردہ جوڑا اب بھی برستی برف میں دنیا و مافیہا سے لا پرواہ ایک دو بجے میں گم تھا۔ کامران نے لڑکے کو دیکھ کر ایک لمبی سی آہ بھری اور بڑبڑاتے ہوئے اپنے آپ سے کہنے لگا ”نہ جانے یہ آج کل لندن کی گوریوں کے معیار کو کیا ہو گیا ہے۔“

کامران لمبے لمبے ڈگ بھرتا زمین پر پچھی برف کی سفید بے داغ پوشاک پر قدموں کے نشان چھوڑتا آگے بڑھ رہا تھا اور میں کسی معمول کی مانند اس کے نقش قدم طے کرتا پیچھے چلا آ رہا تھا۔ کامران کی وہی پُرانی موٹر س کار قریب ہی کہیں پارک تھی۔ اُس نے میرا سامان ڈکی میں رکھا اور ہم کامران کے فلیٹ کی جانب روانہ ہو گئے۔

تھا۔ شاید ہم دونوں کے اندر ایک بے حد قدیم روح بستی تھی۔ کیونکہ قدامت پسندی اور اُداسی لندن شہر کا ہی خاصہ ہے۔ ہر شہر کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ مجھے بھی کبھی چیننے، چنگھاڑتے شہر اچھے نہیں لگے۔ گرم، جس زدہ اور بے چین۔۔۔۔۔ جیسے ہر لمحہ کچھ کھوجانے کا احساس دل کو جکڑے رکھے، مجھے سرد اور ٹھنڈے مزاج کے لوگ اور شہر ہمیشہ سے متاثر کرتے تھے، خاموش اور پُرسکون، انسان کا ہر غم، ہر دکھ اپنے اندر سمیٹ لینے والے شہر، لندن بھی انہی شہروں میں سے ایک تھا۔

میرے سامنے سے ایک نوجوان جوڑا ہنستے ہوئے گزرا، لڑکی نے غور سے میری جانب دیکھا، اُس کے رخسار سردی سے سُرخ انگارہ سے ہو رہے تھے اور آنکھوں میں اک ازلی مسکراہٹ تھی۔ لڑکی مجھے دیکھ کر مسکرا پڑی اور دونوں مجھے وِش (Wish) کرتے ہوئے کچھ فاصلے پر رکھے دوسرے بیچ پر جا کر بیٹھ گئے اور راز و نیاز میں مصروف ہو گئے۔ دونوں کے لباس سے ظاہر تھا کہ وہ صبح سویرے جاگنگ (Joging) وغیرہ کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ یہ موسم اور ان منچلوں کی یہ ادا، میں یہ سوچ کر مسکرا دیا۔ موسم بھی ہر انسان پر کچھ الگ ہی طور اُترتے ہیں۔ مجھے یاد ہے میرے آبائی شہر کوئٹہ میں جب رات بھر برف گرتی تھی تو صبح سویرے غریب مزدور طبقہ اپنے بال بچوں سمیت چھوٹے بڑے نیچے اور لکڑی کے بڑے بڑے پھٹے لے کر دروازے کے سامنے سے اور چھت کے اوپر سے برف ہٹانے میں جُت جاتا۔۔۔۔۔ کیونکہ یہ برف ان کے کچے گھر کی چھت پر زیادہ دیر لگتی تو چھت کو چھلنی بنا دیتی تھی۔ ان غریبوں کی ساری سردیاں ایسے بریلے موسم سے پناہ مانگنے میں ہی گزر جاتی تھیں۔ اور یہاں لندن میں اس بریلی صبح میں یہ دو متوالے موسم کا لطف لینے گھر سے نکلے تھے۔ ایک ہی موسم کسی بھی دو افراد پر دو مختلف صورتوں میں کیسے وارد ہو سکتا ہے۔ موسم تو بس موسم ہی ہوتا ہے۔ اچانک میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا، میرے کاندھے کو کوئی زور زور سے ہلا رہا تھا۔

”اٹھ جائیے صاحب، نارروال کا جنکشن آ گیا ہے۔“

میں نے چونک کر اُپر دیکھا، کامران گرم کپڑوں میں لپٹا، صرف چہرہ باہر نکالے اپنی ترم تر خباثتوں کے ساتھ کھڑا سکر رہا تھا۔ ہم دونوں بغل گیر ہو گئے ”معاف کرنا میڈی یار،

دوسرا گروپ ٹاک کوکٹری کی ایک موٹی کیل سے سنوارنا چاہتا تھا۔ بالآخر دونوں گروپوں میں گاجر پر اتفاق رائے ہو گیا اور پتلے کو ہیٹ، مظفر اور کوٹ وغیرہ بھی پہنا دیا گیا۔ آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگ بچوں کی اس کاوش کوڑک کر دیکھتے اور مسکرا کر آگے بڑھ جاتے۔ اب اندھیرا چھانے لگا تھا، ویسے بھی سردیوں کی شام جلد ہی اتر آتی ہے۔ رفتہ رفتہ بچوں کی ماؤں نے کھڑکیوں اور دروازوں سے جھانکتے ہوئے انہیں پکارنا شروع کر دیا اور بچے ایک ایک کر کے پتلے سے رخصت لیتے ہوئے وہاں سے چل دیے۔ شاید ساری دنیا کی مائیں اندر سے ایک ہی جیسی ہوتی ہیں۔ اندھیرے میں بچوں کو کھیلنے سے منع کرنے والیاں۔۔۔۔۔ شام ڈھلنے سے پہلے گھر واپس لوٹ آنے کی تاکید کرنے والیاں۔۔۔۔۔ اور بچوں کے دیر تک نہ آنے پر دروازوں، کھڑکیوں اور صحن میں کھڑے ہو کر آواز لگانے والیاں۔۔۔۔۔

جیسے جیسے شام ہو رہی تھی، سردی کی شدت بھی بڑھتی جا رہی تھی، سڑک کے کنارے کھڑا کافی والا اسپریسو (Espresso) کافی کے گرم گمگماتے جاتے راہ گیروں کو پیش کر رہا تھا۔ سردی سے ٹھٹھرتے جوڑے چلتے چلتے کچھ دیر کورکتے اور گرم کافی حلق میں انڈیل کر آگے بڑھ جاتے۔ اس وقت بھی ایک خوبصورت نوجوان جوڑا اسٹال کے سامنے کافی پینے کے لیے رکا ہوا تھا۔ لڑکی اپنی بڑی بڑی آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے کافی کے بڑے سے گم سے نکلتی ہوئی بھاپ کے عقب سے شرارت سے لڑکے کو دیکھ رہی تھی اور باتیں کرتے ہوئے مسکرائے جا رہی تھی۔ ہم انسان بھی کس قدر ظاہر پرست، اور ظاہر پسند ہوتے ہیں۔ کافی کے گم سے اٹھتا ہوا دھواں سب کو دکھائی دے جاتا ہے، لیکن اپنے آس پاس بستے انسانوں کے سینے سے اٹھتا ہوا دھواں سب کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ اب مکمل اندھیرا چھا چکا تھا۔ سڑک کے کناروں پر لگے لیمپ پوسٹ جل چکے تھے۔ پھر وہی شام تھی، پھر وہی میں تھا اور پھر وہی بیتی یادوں کے مہیب سائے تھے۔ کہتے ہیں شام زوال کا وقت ہوتا ہے اور زوال صرف سورج کا ہی تو نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ مجھ پر تو ویسے بھی یہ وقت زوال بہت بھاری ثابت ہوتا تھا۔ جتنی تنہائی میں نے اپنی زندگی میں شام کے وقت محسوس کی ہے۔۔۔۔۔ اتنی کسی اور پہر میں کبھی نہیں جھیلی۔

(فتمتاً) فلیٹ کے لاؤنج میں رکھا فون بج اُٹھا۔ دوسری طرف سے کامران کی چبکتی ہوئی

پھر وہی شام

ہم گھنٹے بھر میں ہی کامران کے ساؤتھ لندن والے حصے میں موجود فلیٹ پہنچ گئے تھے۔ جب تک میںں ساؤر لے کر فارغ ہوا تب تک کامران ناشتہ بنا چکا تھا مجھے کچھ خاص بھوک نہیں تھی لیکن کامران حسب معمول اپنی پُر جوش روایتی مہمان نوازی کا مظاہرہ کرنے میں کچھ زیادہ ہی محو تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد میںں لمبی تان کر سو گیا۔ کامران بھی اپنے ریسٹورنٹ کے لیے نکل پڑا۔

شاید شام کے چار بجے ہوں گے جب میری آنکھ کسی شور سے کھل گئی کا مران کا یہ فلیٹ ساؤتھ لندن کے پوش ایریا میں واقع تھا۔ یہ دراصل سُرخ اینٹوں سے بنے دو منزلہ اپارٹمنٹس کی ایک لمبی سی قطار تھی، جس میں انتہائی چوڑی سڑکوں کے درمیان یہ اپارٹمنٹس شاید آٹھ یا دس قطاروں میں بنے ہوئے تھے۔ ہر قطار میں آٹھ دو منزلہ اپارٹمنٹ اس طرح ساتھ ساتھ جڑے ہوئے تھے کہ سب مکانوں کے آگے کا باغیچہ ایک لمبی سی قطار میں سیدھا چلا گیا تھا۔ البتہ درمیان میں سب مکانوں کو علیحدہ کرنے کے لیے خوبصورت توازن سے کٹی ہوئی ہری باڑھ موجود تھی۔ ہر مکان کے باہر ایک خوبصورت سا پوسٹ بکس لگا ہوا تھا جس پر مالک مکان کا نام کندہ تھا۔ مجھے یاد تھا جب ہم چھوٹے تھے تو ڈرائنگ کی کاپی پر لکڑی کے اسی پوسٹ بکس جیسا ایک چھوٹا سا مکان ہر بچہ بناتا تھا۔ میرے کمرے کی کھڑی اپنی بالکونی سمیت پچھلی سڑک کی طرف کھلتی تھی۔ یہ ہلکا سا شور بھی اسی پچھلی سڑک پر بنے قطار نمبر 2 کے اپارٹمنٹس کی طرف سے آرہا تھا۔ میں بالکنی میں کھلتا شیٹے کا دروازہ کھول کر ٹیرس میں نکل آیا۔ برف باری تھم چکی تھی لیکن آس پاس دُور تک ہر چیز کو برف نے ڈھانپ دیا تھا، سڑک کے پار گلی کے چند بچے برف کا پتلا بنانے میں مشغول تھے، یہ شور انہی کے معصوم قہقہوں اور آہیں، ہنسنے کا تھا۔ ان میں سے ایک گروپ تلے کی ناک کی جگہ گاجر لگانا چاہتا تھا جبکہ

ماس دلا دیا کہ محبت صرف ایک بے وقوفی ہے۔ اپنے گھر کا عیش و آرام چھوڑ کر صحراؤں اور لگوں کی خاک چھاننے والے صرف احمق ہوتے ہیں، اور کچھ نہیں۔“

کامران صوفے سے اٹھ کر میری جانب آیا اور میرے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر جھک کر لی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ”میں تمہیں چھ سال کی عمر سے جانتا ہوں مسٹر حماد احمد رضا۔ پچھلے بیس سالوں سے ہم دونوں ایک ساتھ ہیں۔ ہمارا بچپن، ہماری جوانی ایک امرے کے سامنے کسی آئینے کی طرح عیاں ہے۔ تمہارا شمار انہی احمقوں میں ہوتا ہے جو گھر لازم بستر چھوڑ کر در بدر کی تپتی ریت چھاننے پھرتے ہیں۔ اس وقت تم تھکے ہوئے ہو، مگر سو جاؤ۔ ہم اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے۔“

کامران مجھے تھکی دیتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میں وہیں آرام کرسی پر گزری کے سامنے بیٹھا باہر سناٹے میں درختوں کی ٹہنیوں سے، جو برف کے بوجھ سے ہماری ہو کر جھکی ہوئی تھیں برف گرنے کی مخصوص دھپ دھپ سنتا رہا۔ باہر آسمان سرخ اکارہ سا ہو گیا تھا۔ اور یہاں اندر کمرے میں آتش دان میں جلتی لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز اور دیوار پر لپکتے شعلوں کے سائے تھے۔ رات ڈھل رہی تھی اور میرا ذہن ماضی کے درپچوں اہلا نکتا ہوا دو سال پہلے کی اس شام کی یادوں تک جا پہنچا تھا جب میری ایمان سے پہلی لمحات ہوئی تھی۔

oo

آواز سنائی دی۔ ”اے میرے ادا سیوں کے پرستان کے شہزادے۔۔۔۔۔ رات کے کھانے کا کیا پروگرام ہے۔ اگر باہر چلنا ہے تو تیار ہو جاؤ، میں آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔ اگر گھر پر ہی کھانا ہے تو میں ڈرائیور سے کہتا ہوں کہ راستے سے کچھ لیتے ہوئے گھر چلے۔“ مجھے کچھ حیرت سی ہوئی ”تم نے ڈرائیور رکھ لیا ہے؟ وہ کیوں۔“ کامران کی مخصوص ہنسی کی آواز فون پر گونجی۔ ”دراصل جب میں اپنے کیفے کو بند کر کے نکلتا ہوں تو وہاں بے گھر تک کے راستے میں میں خود اپنے آپ ہی اپنا ڈرائیور ہوتا ہوں۔ دوسروں کو ڈرائیور کا بتانے میں شخصیت ذرا رعب دار رہتی ہے۔“ میرے منہ سے اس کی شان میں کچھ الفاظ نکلے اور میں نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ”تم کبھی نہیں سدھر سکتے میرا گھر سے نکلنے کا موڈ نہیں ہے۔ کھانا گھر پر ہی کھائیں گے۔“

کچھ ہی دیر میں کامران رات کے کھانے کے تمام لوازمات سمیت آن موجود ہوا۔ وہ آتے ہوئے تیار کھانا ہی بازار سے لیتا آیا تھا جسے اُس نے کچھ ہی دیر میں کسی گھڑ عورت کی طرح گرم کر کے کھانے کی میز پر لگا دیا۔ کھانے کے بعد کافی کا ایک دور چلا اور پھر آخر کار کامران کی زبان پر وہ بات آ ہی گئی جسے میں انجانے میں صبح سے ہی مالتا چلا آ رہا تھا۔ کامران نے کافی کا ایک لمبا سا سپ لیتے ہوئے غور سے میری جانب دیکھا ”تم اتنی آسانی سے ہتھیار ڈال دو گے۔۔۔۔۔ ایسی اُمید مجھے تم سے ہرگز نہیں تھی میڈی۔“ میں نے دانستہ اس کی جانب دیکھنے سے گریز کیا۔۔۔۔۔ ”جب دشمن خود مد مقابل کے خیمے میں آ کر فریاد کرے کہ یہی ایک جیت اس کی زندگی کا حاصل ہے تو مجھ جیسوں کو ہتھیار ڈالنے ہی پڑتے ہیں۔“

کامران کی بے چینی میرے جواب سے کم ہونے کے بجائے کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ جھنجھلا کر بولا۔ ”مجھے تمہاری منطق آج تک سمجھ نہیں آئی۔ تم نے اس ایک لڑکی کے لیے زمانے بھر سے بغاوت مول لی تھی۔ سارے گھرانے کی مخالفت کے باوجود تم اپنی جگہ ڈٹ گئے تھے۔ کیا کچھ نہیں سہا تم نے۔ باپ نے تمہیں عاق کر ڈالا۔ ماں نے ناطہ توڑ لیا۔ گھربار چھوٹ گیا، پھر یکا یک تم نے دست برداری کا اعلان کیسے کر دیا۔“

میرے لبوں پر کمزوری اک مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”شاید زمانے کی سختیوں نے مجھے

تھی لہذا بھابھی اور امی خود ہی گھر کی پارٹیز اور تقریبات وغیرہ کے اہتمام میں بختی رہتی تھیں۔ اب رہ گئے میں یعنی حماد امجد صاحب اور مجھ سے چھوٹا اور گھر بھر کا لاڈلا عباد تو ہم دونوں ہی کو گھر کے ان ہنگاموں اور شور شرابوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے حال ہی میں ماسٹرز کیا تھا اور اب عباد بھی گریجویشن کے بعد فارغ ہو چکا تھا۔ مجھے شروع سے ہی زندگی کو باقاعدہ کسی منصوبہ بندی کے تحت گزارنے کی عادت نہ تھی۔ اس لیے بابا کے لاکھ کہنے کے باوجود میں ان کے کاروبار میں اب تک ان کا ہاتھ بٹانے میں اپنا دھیان نہیں لگا پایا تھا۔ اور اس بات پر بابا آج کل مجھ سے کچھ ناراض بھی رہتے تھے۔ دوسری جانب عباد تھا جو پاکستان میں کچھ کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اُسے ہمیشہ سے ہی باہر جا کر رہنے کا جنون تھا۔ لیکن بابا سے کوئی حتمی بات کرنے سے اس کی بھی جان جاتی تھی۔ ہمارے گھر میں آئے روز کسی نہ کسی بات کو بہانہ بنا کر پارٹی دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ ہم امیروں کے پاس خوشی منانے کے بہانے اس قدر کم کیوں ہیں۔۔۔؟ شاید کہیں پڑھی ہوئی یہ بات سچ ہی تھی کہ امیروں کا یہ خیال کہ غریب زیادہ خوش رہتے ہیں، اتنا ہی غلط ہے جتنا کہ غریبوں کا یہ گمان کہ امیر ان سے زیادہ خوش ہیں۔

آج بھی ہمارے گھر میں ایک پارٹی تھی۔ بہانہ یہ تھا کہ سجاد بھائی کے اکلوتے بیٹے نے آج پہلا سپارہ ختم کر لیا تھا۔ ہم امیر گھرانوں میں دوسروں کے دیکھا دیکھی آج کل بچوں کو باقاعدہ کسی مولوی سے شام کو سپارہ پڑھوانے کا فیشن بھی زوروں پر تھا۔ یا پھر شاید اس کے پیچھے بابا کے بچپن کی سخت تربیت اور دادا کی مخصوص پرورش کا بھی ہاتھ تھا۔ انہوں نے سجاد بھائی کو باقاعدہ حکم دے کر ان کے بیٹے سنی کے لیے کسی مولوی کا انتظام کرنے کا کہا تھا جو بچے کو شام کو آکر قرآن کا سبق دے جاتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ مہینے کے بیشتر دن بے چارے مولوی صاحب کو بنگلے کے گیٹ سے ہی بنا سبق دیے واپس پلٹنا پڑتا تھا کیونکہ زیادہ تر گھر میں کسی نہ کسی پارٹی یا تقریب کا ہنگامہ ہی لگا رہتا تھا۔ اب ایسی ماڈرن پارٹیز میں بھلا ایک میدھے سادھے مولانا ٹائپ مولوی اور اُس کی پرانی سی سائیکل کا بھلا کیا جوڑ۔۔۔؟ خود ہا بھی کو بھی مولوی صاحب کا یہ ننھا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا، لیکن بابا کے رعب کے آگے بھلا مسمیٰ کی کب چلتی۔۔۔؟ لہذا بادل نخواستہ اس رسم کو نبھایا جا رہا تھا۔ جانے ہم امیر ایسی

محبت..... نیلا موسم

ہمارا گھرانہ شہر کے انتہائی متمول اور بااثر گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ بابا بطور کمشنر ریٹائر ہونے کے بعد باپ دادا کی وسیع و عریض زمینوں کے انتظامات سنبھالتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کبھی پکے زمین دار نہ بن سکے اور ان کے اندر چھپا ایک سخت بیوروکریٹ ان کی شخصیت پر ہمیشہ سے نمایاں اور حاوی رہا تھا۔ امی خود ایک بہت بڑے زمین دار کی بیٹی تھیں اور ان کے اندر پڑھی لکھی جاگیردار نیوں کی تمام خصوصیات موجود تھیں۔ انگلش ادب میں ماسٹرز بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ پایا تھا۔ ہم تین بھائی اور ایک بہن سمیت یہ خوش حال گھرانہ زندگی کی مخصوص ڈگر پر رواں دواں تھا۔ بابا کے رابطے ملک کے انتہائی اہم سیاست دانوں سے ہمہ وقت رہتے تھے اور ہمارے ڈرائنگ روم میں ہر شام بابا کی بینک ملک کے موجودہ حکمران طبقے کے دزیروں سے رہتی تھی۔ مجھے بچپن سے ہمیشہ اس بات پر حیرت رہی تھی کہ ملک میں حکومتیں تو بدلتی رہتی تھیں لیکن بابا کی بینک میں وہی چند مخصوص چہرے روپ بدل بدل کر موجود رہتے تھے۔ شاید بابا کی دوستی ہی ایسے سیاست دانوں سے تھی جو ہر حال میں اقتدار کے پالنے میں جھولتے رہتے تھے۔ شاید اسی لیے انہوں نے اپنے سب سے بڑے بیٹے سجاد اور بیٹی مدیحہ کی شادی بھی انہی حکمران خاندانوں میں کرادی تھیں۔ میری بہن مدیحہ سندھ کے ایک بہت بااثر خاندان میں بیاہی گئی تھی جو کھلاتے تو سندھ کے تھے، لیکن ان کی نئی نسل نے پاکستان کو صرف دارالحکومت سے زیادہ کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔ مدیحہ بھی اسلام آباد میں ہی رہائش پذیر تھی۔ سجاد بھائی کی شادی بھی پنجاب کے امر خاندان کی بیٹی سے، چکی تھی اور میری بھابھی عبرینہ کو ہر وقت اس بات کی فکر کھائے جاتی تھی کہ کہیں کسی بھی موقع پر ان کا اُدنچا خاندان ہمارے خاندان سے نیچا ثابت نہ ہو جائے۔ ویسے ان کی اور سجاد بھائی کی خوب جھتی تھی، کیونکہ سجاد بھائی کو اپنے بزنس اور بیرون ملک دوروں سے ہنی فرصت نہیں

کی خواتین کو ہی بار ماننا پڑی۔ لیکن اب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ گھر کے خاص نوکروں نے کل ہی مولوی صاحب کو اس تقریب کی وجہ سے آج کوٹھی آنے سے منع کر دیا تھا لہذا ان کے آنے کا کوئی امکان بھی نہ تھا۔ سنی کے آنسو پھر سے ٹپکنے لگ گئے تھے۔ آخر بابا کے خاص ڈرائیور شاکر سے پتہ چلا کہ اُسے مولوی صاحب کے گھر کا پتہ معلوم ہے، کیونکہ پہلے وہ بھی شہر کے اسی پُرانے محلے میں رہتا تھا جہاں مولوی علیم الدین اب تک رہائش پذیر تھے۔ طے یہ پایا کہ شاکر جا کر مولوی صاحب اور ان کی فیملی کو بھی باقاعدہ تقریب میں آنے کی دعوت دے آئے۔ سنی کو شاید شاکر پر زیادہ اعتماد نہیں تھا لہذا وہ خود بھی شاکر کی گاڑی میں سوار ہو کر مولوی صاحب کو لینے چلا گیا کیونکہ اب تقریب کا وقت تو سمجھو ہو ہی چکا تھا، مولوی صاحب کے انتظار میں دیر بھی ہو چکی تھی۔ میں اس وقت اپنے کمرے میں بیڈ پر پڑا سستی سے سامنے رکھے ٹی وی کے چینل بدل رہا تھا جب چھوٹے (عباد) نے میرے کمرے کا دروازہ کھولا۔

”ہے بگ بی، کیا نیچے آنے کا ارادہ نہیں ہے۔ پارٹی شروع ہو چکی ہے۔“ عباد ہمیشہ کی طرح آج بھی شام کی پارٹی کے لیے باقاعدہ سوٹ اور میچنگ بو (Bow) میں ملبوس تھا۔ اُسے دیکھ کر میری بے ساختہ ہنسی نکل پڑی۔

”تم تو اس طرح تیار ہو کر نیچے جا رہے ہو جیسے آج ہی تمہارے رشتے کا بھی فائنل اعلان کر دیا جائے گا۔“

”عباد نے میری بات سن کر بُرا سا منہ بنایا۔“ کم آن بگ بی، آپ بھی نہ۔۔۔۔۔۔ یونو آئی آل ویز ریمین ویل ڈریسڈ (You know I always remain well dressed) میں نے ریوٹ سے ٹی وی آف کیا اور تکیہ عباد کی طرف پھینکا۔

”خوب جانتا ہوں میں تمہاری اس خوش لباسی کو۔۔۔۔۔۔ ضرور کسی نئی محبت کے استقبال کے لیے یوں بن ٹھن کر ہال میں جا رہے ہو۔۔۔۔۔۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آتا کہ یہ سارے شہر کی لڑکیاں کیا آشوب چشم کی بیماری سے دو چار ہیں۔۔۔۔۔۔!۔۔۔۔۔۔ ورنہ بھلا کوئی تمہاری ہانپ دیکھتی ہی کیوں۔۔۔۔۔۔“

عباد ہنسا۔۔۔۔۔۔ گھر کی مرغی دال برابر۔۔۔۔۔۔ آپ سب گھر والے بھلا میری قدر کیا ہائیں۔۔۔۔۔۔ بہر حال۔۔۔۔۔۔ اب آپ بھی دیر نہ کریں۔۔۔۔۔۔ کمشنر صاحب کا حکم ہے کہ

چیزوں سے اتنی دور اور غریب ان رسومات سے اتنے قریب کیوں ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔؟ ہم مذہب کو بھی ایک رسم کی طرح نبھاتے ہیں اور غریب رسم کو بھی کسی مذہبی فریضے کی طرح پٹاتے ہیں۔

خود میری بھی سنی کے مولوی صاحب سے آتے جاتے ایک آدھ بار رسمی سی علیک سلیک بس راستے میں، یا پھر گھر کے مخصوص لاؤنج کے حصے میں جہاں وہ سنی کو سبق دے رہے ہوتے تھے، ہو چکی تھی۔ مولوی علیم الدین صاحب ڈبلے پتلے سے ایک سیدھے سادھے شخص تھے، جنھیں میں نے ہمیشہ سفید کپڑوں ٹرٹا، پاجامہ میں ملبوس ہی دیکھا تھا۔ چہرہ پُر نور، آنکھوں پر نظر کا چشمہ چُپ چاپ اور خاموش سے وضع داری ان کی چال ڈھال سے نمایاں تھی۔ ہمیشہ سر اور آنکھیں جھکا کر بات کرنے والے۔ اپنی پُرانی ریلے سائیکل پر شام چار بجے نہایت پابندی سے آن موجود ہوتے اور نوکر جہاں انھیں بٹھا دیتا وہیں چُپ چاپ خاموش بیٹھے رہتے اور سنی کے نیچے آنے کا انتظار کرتے۔ مجھے اس بات پر بھی ہمیشہ حیرت رہی کہ سنی جیسا شرارتی بچہ ان کے قابو میں کیسے آگیا تھا۔ کیونکہ باقی ٹیوٹرز کی جو درگت وہ بناتا تھا۔ اس کا مظاہرہ میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ لیکن خلاف توقع مولوی صاحب کے سامنے وہ بڑا مذہب بنا بیٹھا رہتا تھا۔ میں نے ایک آدھ بار آتے جاتے سنی کو مولوی صاحب کی نظر بچا کر اُکسانے کی کوشش بھی کی تھی لیکن اس پر کوئی اثر ہی نہیں پڑتا تھا۔

اور شاید یہ سنی کی ہی فرمائش تھی کہ آج کی پارٹی جو خود سنی ہی کے پہلا پارہ ختم کرنے کے اعزاز میں منعقد کی جا رہی ہے۔ اس میں اس کے استاد یعنی مولوی صاحب کی شرکت لازمی تھی ورنہ اس نے گھر بھر کو دھمکی دی تھی کہ وہ خود بھی پارٹی میں نہیں آئے گا اور نہ ہی اپنی ماما کے پسند کے کپڑے پہنے گا۔ امی اور بھابھی سنی کی اس فرمائش پر کافی جذبہ ہوئی تھیں۔ بھلا اس ماؤرن پارٹی میں جہاں شہر بھر کی بیگمات اپنے پالتو نما شوہروں کے ساتھ زرق برق لباسوں، نئے ڈیزائن کی جیولری سے لدی پھندی، لمبی لمبی کاروں اور عالی شان گاڑیوں میں تشریف لائیں گی، ایک لمبی سی سفید داڑھی والے اس غریب سے بزرگ کی جگہ کہاں بنتی تھی۔ محفل میں ناٹ کا پیوند۔۔۔۔۔۔ ہونہ۔۔۔۔۔۔

لیکن سنی کی ضد کے آگے آج تک کسی کی چلی ہے جو اس دن چل پاتی۔۔۔۔۔۔؟ آخر گھر

عباد سمجھانے کے انداز میں بولا ”کم آن بگ بی۔۔۔ بی اے سپورٹ۔۔۔ یہ میں جانتا ہوں یہ صرف دکھاوا ہے۔ لیکن کسی اور کی نہیں تو صرف سنی کی خوشی کے لیے ہی آجائیں، آپ جانتے ہیں وہ آپ سے کس قدر اونچ ہے۔“ عباد دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ میں سنی کی خوشی کے لیے پارٹی میں ضرور شرکت کروں گا چاہے اوپری دل سے ہی سہی۔

شاید ہماری زندگی کے نوے فیصد فیصلوں میں ایسے ہی کسی اپنے کسی لاڈلے کا بھرم رکھنا بنیادی شرط ہوتی ہے۔ ہم بہت تھوڑی زندگی خود اپنے آپ کے لیے جی پاتے ہیں، زیادہ تر تو دوسروں کا بھرم رکھنے میں ہی بسر ہو جاتی ہے۔

00

شہر کی کنٹونمنٹ میں جہاں علاقے کے بڑے امراء کی کوٹھیاں کئی کئی ایکڑوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اسی علاقے میں دورویہ درختوں سے ڈھکی ایک سڑک کے اختتام پر ریٹائرڈ کمشنر امجد رضا کی عظیم الشان حویلی آج پھر برقی قہقروں سے جھللا رہی ہے۔ دھوپ ڈھل چکی تھی لیکن شام کے پر ابھی پوری طرح پھیلے نہیں تھے۔ دُور سے کمشنر صاحب کی پرانی مرسدیز گاڑی، جو اب زیادہ تر گھر کے کام کاج کے لیے استعمال ہوتی تھی، فرائٹ بھرتی ہوئی نمودار ہوئی۔ گاڑی کو گھر کا سب سے پرانا ڈرائیور شا کر چلا رہا تھا اور سستی میاں چہرے پر ان جانی خوشی کے تاثرات لیے یوں بیٹھے تھے جیسے کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے کر لوٹے ہوں۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر سفید چادروں میں ڈھکی، دو چھوٹی موٹی سی لڑکیاں کُمٹی ہوئی بیٹھی تھیں البتہ مولوی علیم کا کچھ اتہ پتہ نہ تھا۔ گاڑی نے حویلی کے بڑے بڑے جنگلوں والے گیٹ کے سامنے پہنچنے سے پہلے ہی مخصوص انداز میں دو مرتبہ ہارن بجا دیا تھا لہذا اسہی جنگلوں والے گیٹ کے ساتھ ہی بنے ہوئے لکڑی کے کیبن سے دو ملازم تیزی سے نکلے اور انہوں نے گاڑی کے گیٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی گیٹ کھول دیا۔ کمشنر صاحب کی نیلی مرسدیز تیزی سے گھر میں داخل ہو گئی۔

00

جب تک میں تیار ہو کر نیچے حال میں پہنچا تب تک تقریباً کبھی مہمان آ چکے تھے۔ سنی نے مجھے دیکھتے ہی دور سے یوں ہاتھ ہلایا جیسے وہ مجھے کوئی خاص بات بتانا چاہتا ہو۔ لیکن اس وقت وہ خود سفید کرتا پا جامہ پہنے اپنے دوستوں اور کزنز وغیرہ میں اس قدر گمراہ ہوا تھا کہ اس کا لہری طور پر مجھ تک پہنچنا ناممکن تھا۔ عباد صاحب حسب معمول بیگمات کے ساتھ آئی ہوئی ان لی بیٹیوں اور دوسری لڑکیوں کو متاثر کرنے کی حتی الوسع کوششوں میں مصروف تھے۔ ایک

طرف بابا اور سجاد بھائی ہمیشہ کی طرح اس پارٹی میں آئے ہوئے چند بڑے ناموں کے ساتھ
 بزنس ڈیلز کے چکر میں لگے ہوئے تھے۔ بابا ایسے موقع کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

ہال میں کافی چہل پہل تھی، ہر طرف جیسے رنگ و نور کی برسات ہو۔ ایک طرف ای اور عریہ بھا بھی بیگمات کو متاثر کرنے کا ہر حربہ استعمال کر رہی تھیں۔ جیولری کی باتیں تھیں۔ نئے آنے والے فیشن کی باتیں تھیں۔ گرمیوں کی چھٹیاں فرانس یا سوئٹزرلینڈ میں گزارنے کی باتیں تھیں۔ رنگین آنچل ہر طرف لہرا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے سنی کے پہلے پارے کی رسم نہ ہو بلکہ اس کے نکاح کی تقریب ہو۔ میرے سیڑھیوں سے اترتے اترتے بہت سی خواب ناک لگا ہوں کے سلام مجھ تک پہنچ چکے تھے۔ لیکن بقول کامران میں اس معاملے میں انتہائی ناشکرا واقع ہوا تھا۔ پتہ نہیں کیوں۔۔۔۔۔ مجھے محبت وغیرہ قسم کی چیزوں کا سوچ کر ہی ہنسی آ جاتی تھی۔ مجھے عورت کبھی برتنے کی حد تک بھی اس طرح پسند نہیں آئی تھی جیسا کہ عام رومانوی داستانوں میں بیان کیا جاتا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے بچپن سے ہی مخلوط اداروں میں تعلیم (Co-education) حاصل کی تھی۔ بچپن سے ہی میری بہترین دوست صرف لڑکیاں ہی رہی تھیں۔ میں انہی کے ساتھ بچپن میں انہی کے کھانوں کے کمروں سے لے کر نو جوانی کے اسٹڈی رومز اور پھر جوانی میں بیڈ رومز تک ساتھ ساتھ رہا تھا۔ میرے لیے اس محفل کی تمام لڑکیاں بس لڑکیاں ہی تو تھیں۔ جیسے کسی ہاسٹل میں رہتے ہوئے بہت سے کلاس فیلوز۔۔۔۔۔ سبھی مجھے اور میں سبھی کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ ان میں سے کئی ایک کا خاص راز دار بھی رہ چکا تھا۔ لیکن میں نہ جانے کبھی اس بات کو کیوں محسوس نہ کر پایا تھا کہ یہ سب اب بچپن اور نو جوانی سے نکل کر اس عمر میں پہنچ چکی ہیں جہاں اب کوئی ایک نامحرم ہی ان کا راز دار ہو سکتا ہے۔ یہ سب بابا کے ساتھ کے ریٹائرڈ بیوروکریٹس اور امراء کی بیٹیاں تھیں جن کے ماڈرن خُسن کے ایک دیدار کے لیے شہر اور کالج کے عام لڑکے سارا دن چھاؤنی کی سڑکوں کی خاک چھانتے ہوئے گزاردیتے تھے۔ لیکن میں اس حسن کے اس قدر قریب رہا تھا کہ اب میرے لیے اس کا نظارہ ایک معمول کی بات تھی۔ اور پھر سچی بات تو یہ ہے کہ اپنی جیسی ہی ایک جنس کے لیے اس قدر بے تابی کا مطلب۔۔۔۔۔ مجھے تو زیادہ تر حسین لڑکیاں بے وقوف ہی ملی تھیں، وہی ان سب کا ایک ہی جیسا انداز لڑکوں کے سامنے سنجیدہ

حیرت کی بات یہ ہے کہ سبھی لڑکیوں کے راز، ان کے گلے شکوے اور ان کی باتیں تنہائی میں ایک جیسی ہی ہوتی تھیں۔ شاندار دنیا کی مہربانی ایک ہی جگہ اور ایک ہی قسم کی نئی سے بنائی گئی ہیں۔ تنہائی میں سبھی مجھ سے شکوہ کرتیں۔ پڑھائی ختم ہونے کے بعد اب میں ان پر توجہ ہی نہیں دے رہا، کسی نہ کسی بہانے میرا ہاتھ تمام لیتیں۔ مجھ سے روشتیں اور بچہ

خود ہی من بھی جانتیں۔ سبھی کا یہ گلہ ہوتا کہ میں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ میں ان کے لیے کیا معنی رکھتا ہوں۔۔۔۔ اور یہ کہ سبھی نے میری بچپن اور لڑکپن کی یادوں کو کس قدر سینت سینت کر اور سنبھال سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ سبھی کا رومان ایک ہی جیسا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے اس بات پر بھی بہت حیرت ہوتی تھی کہ ان لڑکیوں کے دماغ میں بچپن کی یادیں اور بچپن کا رومان اس قدر گہرا اثر لیے ہوئے کیوں ہوتا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے بچپن میں لڑکیاں وہ معصوم دوستی ہی اس لیے کرتی ہیں کہ بڑے ہو کر جوانی میں اسی دوست کو اپنے خوابوں کا شہزادہ بنالیں۔۔۔۔؟

بحر حال۔۔۔۔ اس وقت میں اس رومان سے بالکل بے خبر تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کسی کا محبوب ہونا کس قدر اعزاز کی بات ہوتی ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ لوگوں کا محبوب بننے میں عمریں بیت جاتی ہیں لیکن تب بھی یہ مسند کی کسی ایک آدھ خوش نصیب کا ہی مقدر ٹھہرتی ہے۔ ہماری ساری عمر دوسروں کو اپنا محبوب بنانے میں ہی صرف ہو جاتی ہے۔ کیونکہ خود کسی کا محبوب بننا ہمارے اختیار میں ہوتا ہی کب ہے؟ یہ اعزاز تو صرف آسمان سے ہی وارد ہوتا ہے۔ لیکن ستم یہ ہے کہ اس اعزاز کو پانے والے خود اس اعزاز، اس رتبے کی حرمت سے بے خبر ہوتے ہیں۔

میں سبھی سے ملتا ملتا، ان نازنیوں کو چھیڑتا اور ان سے اٹھکیا یاں کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ اس بات سے بے خبر کہ محبت کا نیلا موسم میرے بہت قریب یوں بکھر رہا ہے جیسے وہ صدیوں سے بس میری ہی تاک میں ہو۔ اور تبھی دفعتاً میرے قدم جسے ہال کے لکڑی سے بنے فرش پر جم سے گئے۔ میرے آس پاس کا سبھی شور، وہ غرتی قہقہوں کا جاترنگ تہم سا گیا۔ فضا ساکت سی ہو گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے کسی خود کار ریموٹ کے ذریعے اس ساری محفل کو چند ساعتوں کے لیے جامد (Pause) کر دیا ہو۔ وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ ڈری سی، سہمی سی۔۔۔۔ بڑے سے سفید دوپٹے کی آڑھ لے کر۔۔۔۔ آس پاس سے گزرتے مردوں کی نظر سے بچنے کی کوشش میں اس کا سونے جیسا رنگ گلابی آمیزش سے اور بھی تپنے لگا تھا۔ ایک ساعت کے لیے اس کی گھنی کالی پلکیں اُنھیں اور میں ہمیشہ کے لیے ان آنکھوں میں غرق ہو گیا۔ چند لمحوں میں کیا سے کیا ہو گیا۔۔۔۔؟ اگر لوگ اسی کو کیو پڈ کا دار کہتے ہیں تو

اس سے زیادہ بے رحم اور سفاک وار آج تک میں نے اپنی تمام زندگی میں نہیں جھیلا تھا۔۔۔۔۔ جانے وہ لڑکی کون تھی۔ سفید کرتے اور تنگ پا جاے میں ملبوس۔۔۔۔۔ اس کے نازک سے سراپے نے جیسے اُس پوری محفل کو ناٹ کا بنا دیا تھا۔۔۔۔۔ اور وہ خود اس ناٹ میں محفل کے ایک پیوند کی طرح لگی بیٹھی تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ اس لڑکی کے علاوہ اس محفل میں دوسری کوئی حسین موجود نہ تھی۔ وہاں تو نازنیوں کی بھرمار تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک عشوہ طراز، نازک اندام مہرہ جینیوں کا جھرمٹ موجود تھا وہاں۔۔۔۔۔ لیکن اس لڑکی میں جو ایک کونے میں اپنے جیسے ہی حلیے میں ملبوس ایک نسبتاً کم عمر کی لڑکی کے ساتھ چپ چاپ خاموش سی بیٹھی تھی، جانے ایسی کیا بات تھی، وہ سر کے بالوں سے نکلی ایک لمبی سی شریر لٹ سے لے کر پاؤں میں پہنے نازک سے کھنوں تک پورا ایک جہاں ہی تو تھی۔ آس پاس سے گزرتے مرد اور عورتیں حیرت سے ان دو لڑکیوں کو دیکھتے جو کسی بھی طرح اس پارٹی سے اور اس کے ماحول سے میل نہیں کھا رہی تھیں۔

اچانک مجھے اجساں ہوا کہ کوئی ننھا سا ہاتھ میرے کوٹ کی آستین کھینچ رہا ہے۔ میں اپنے خیالات کی رو سے باہر نکل آیا۔ سنی جانے کب سے مجھے آوازیں دے رہا تھا ”چاچو۔۔۔۔۔ میری بات تو سنئے۔۔۔۔۔ میڈی چاچو۔۔۔۔۔“

میں اس کی طرف متوجہ ہوا لیکن میرا دھیان اب بھی اسی لڑکی میں اٹکا ہوا تھا۔ سنی مجھ سے کچھ ناراض تھا۔ ”جائیے چاچو۔۔۔۔۔ میں آپ سے بات نہیں کروں گا۔ آج سب نے مجھے گفٹ دیے ہیں لیکن آپ نے ابھی تک۔۔۔۔۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر پاس پڑی میز پر بٹھا دیا۔ ”ارے یار۔۔۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہارا میڈی چاچو تمہیں آج کوئی گفٹ نہ دے۔ بولو کیا چاہیے۔ سنی کے چہرے پر معصوم سی خوشی لہرائی اور وہ باقاعدہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”ہوں۔۔۔۔۔ نیا پلے اسٹیشن۔۔۔۔۔ دو جاکیز Jokies کے ساتھ۔۔۔۔۔“

میں نے ہامی بھر لی۔ ”چلو منظور ہے۔۔۔۔۔ کل تک تمہارے روم میں موجود ہو گا۔ اب خوش۔۔۔۔۔“ سنی نے خوشی سے نعرہ لگایا، ”اوہ چاچو۔۔۔۔۔ یو آر گریٹ“، اب میں اپنے مطلب کی بات پر آیا۔ ”لیکن یار۔۔۔۔۔ آج تمہاری پارٹی میں کچھ نئے لوگ بھی نظر آ رہے

ہیں۔ تم نے تعارف بھی نہیں کروایا ان سے“ میں نے دو بیٹھی دونوں لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”اوہ وہ دونوں۔۔۔۔ وہ تو ایمان آپی اور حیا باجی ہیں۔ وہ جو ہیں نامیرے مولوی صاحب۔۔۔۔ انہی کی بیٹیاں ہیں۔ صرف میرے لیے آج یہاں آئی ہیں۔“ سنی میاں بڑے فخر سے بتا رہے تھے اور میری نظر میں اسی قیامت کے سراپے کا طواف کر رہی تھیں۔ پتہ یہ چلا کہ جب ڈرائیور شا کر سنی کے ساتھ مولوی صاحب کے گھر پہنچا تو وہاں جا کر معلوم ہوا کہ مولوی صاحب تو گزشتہ رات سے بخار میں تپ رہے تھے۔ ان کا تقریب میں شرکت کرنا ناممکن تھا۔ لیکن سنی میاں چل گئے کہ اگر مولوی صاحب کی طرف سے اس کی رسم کشائی کی تقریب میں کوئی شریک نہ ہوا تو سنی وہ تقریب ہی ملتوی کر دے گا۔ دراصل سنی پہلے بھی ڈرائیور کے ساتھ کئی مرتبہ مولوی صاحب کو ان کے گھر ڈراپ کروانے جا چکا تھا۔ کبھی خراب موسم کی وجہ سے اور کبھی مولوی صاحب کی اکلوتی سائیکل کی کسی خرابی کی وجہ سے، اور جب کبھی بھی مولوی صاحب سنی کے ساتھ کمشنر صاحب کی کسی گاؤں میں گھر آتے تو سنی کا گھر کا بنا ہوا خاص شلنگھیں پلوائے بناء، جانے نہ دیتے۔ جو خود سنی کا بھی خاص پسندیدہ مشروب تھا۔ اور یہ مشروب بنانے والی ہوتیں سنی میاں کی ایمان آپی، یوں سنی مولوی صاحب کے تمام گھر والوں سے خوب گھل مل چکا تھا۔ مولوی صاحب کی بیوی اور بیٹیاں بھی سنی سے بہت مانوس ہو چکی تھیں۔ شاید اسی لیے اس دن سنی کی ضد کے سامنے مولوی صاحب کو ہار ماننا ہی پڑی۔ ان کی بیوی تو ایسی تقاریب میں جانے کے نام سے ہی ہول کھاتی تھی۔ سوانہوں نے دبے الفاظ میں چھوٹی بیٹی حیا کو سنی کے ساتھ بھیجنے کی تجویز دی۔ عام طور پر مولوی صاحب ایسی باتوں کو سخت ناپسند کرتے تھے لیکن جانے کیا سوچ کر انہوں نے کچھ دیر کے لیے حیا کو جانے کی اجازت دے دی۔ لیکن حیا نے اکیلے جانے سے صاف منع کر دیا تب کوٹھی کا پرانا ڈرائیور شا کر جو بہت دیر سے گھر کے دروازے پر گاڑی لیے سنی کے انتظار میں کھڑا تھا۔ دروازے پر آیا اور تمام محلے کی سگن ملنے کے بعد اس نے بخار سے لرزتے کانپتے مولوی صاحب کو تسلی دی کہ حیا اور ایمان دونوں ہی اس کی اپنی بچیاں ہیں اور اسی کے ہاتھوں میں بچیل کر جوان ہونیں۔ اس نے مولوی صاحب سے درخواست کی کہ وہ دونوں بچیوں کو سنی میاں کی

خوشی کے لیے چاہے تھوڑی دیر کو ہی سہی، تقریب میں جانے کی اجازت دے دیں۔ شا کر خود انہیں رسم کشائی کے فوراً بعد واپس گھر چھوڑ دے گا۔ حیا کی حد تک تو مولوی صاحب اپنے دل کو منا چکے تھے لیکن ایمان نے تو جوانی کے بعد گھر کی دہلیز سے تنہا قدم باہر نہیں دھرا تھا، جانے کس بھاری دل سے انہوں نے شا کر کی یہ تجویز مان لی۔ جانے شا کر سے پرانی محلے داری کا پاس تھا یا پھر وہ سنی کا دل نہیں توڑنا چاہتے تھے، لیکن جب تک دونوں لڑکیاں گھر سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ نہیں گئیں وہ بے چینی سے گھر کے صحن اور باہر گلی میں کھڑی گاڑی تک کے چکر کاٹتے رہے۔ اور گاڑی کے چلتے چلتے بھی انہوں نے شا کر کو کئی مرتبہ کی دھرائی ہوئی ہدایات پھر سے دوبارہ یاد دہانی کے طور پر دہرائیں۔

ہماری زندگی میں کب، کس موڑ پر کون سا حادثہ ہماری تاک میں ہے۔ یہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ میری اپنی دانست میں محبت سے بڑا کوئی اور حادثہ ایسا نہیں جو ہماری زندگیوں میں وارد ہوتا ہو۔ اور ہم انسان اتنے مجبور اور لاچار ہوتے ہیں کہ ایسے ہر حادثے کا الزام لفظ ”کاش“ کو ہی دیے جاتے ہیں۔ کاش میں اس دن گھر پر ہی نہ ہوتا، کاش مولوی صاحب اس دن بیمار نہ ہوتے، کاش سنی انہیں لینے خود ان کے گھر نہ جاتا اور اگر چلا بھی گیا تھا تو ایمان اس کے ساتھ نہ آتی۔۔۔۔۔ کاش۔۔۔۔۔ کاش۔۔۔۔۔

اس کے بعد اس تقریب میں کیا ہوا۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ شاید میں اپنے ہوش و حواس ہی کھو بیٹھا تھا۔ دوسری بار جب میں نے اس طرف نظریں دوڑائیں جہاں ایمان اور حیا سمٹی بیٹھی تھیں تو وہ جگہ خالی تھی۔ میں نے بے چینی سے تمام محفل چھان ماری لیکن ایمان جا چکی تھی۔ پتہ یہ چلا کہ شا کر چونکہ مولوی صاحب سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ مغرب کی اذان سے قبل ان دونوں کو گھر واپس پہنچا دے گا۔ اس لیے ان دونوں نے تقریب کے خاتمے سے قبل ہی شا کر کو واپسی کا پیغام بھجوادیا تھا۔ اور جانے کس لمحے وہ وہاں سے چلی بھی گئیں اور میں اپنی قسمت کو کوستا ہی رہ گیا۔

لیکن جاتے جاتے وہ لڑکی جیسے میرا بہت کچھ اپنے ساتھ ہی لے گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے تک وہ پارٹی، وہ محفل جس میں چاروں طرف رنگوں کی برسات تھی، نور کا بسیرا تھا، تہنہ تھے۔ مسکراہٹیں تھیں۔۔۔۔۔ یکا یک یوں ویران ہو گئی تھی جیسے اچانک کسی نے اس محفل سے سب

لندن اُداس ہے

کہتے ہیں نیند سب سے بڑی چور ہوتی ہے، وہ انسان کی آدھی عمر چالیتی ہے۔ لیکن مجھے ایسا لگتا تھا جیسے مجھ سے میری یہ چور بھی روٹھی ہوئی تھی۔

جانے رات کے کس پہر کامران نے لاؤنج میں جھانکا اور مجھے وہیں آتش دان کے پاس آرام کرسی پر آنکھیں موندھے لیٹے دیکھ کر مجھ پر کھل ڈال گیا۔ رات یونہی ماضی کے درپچوں میں جھانکتے ہوئے جانے کب بیت گئی اور اس کی جگہ صبح کے اُجالے نے لے لی۔ رات بھر برف باری کے بعد آسمان صاف ہو چکا تھا۔ کامران نے ناشتے کے دوران مجھے آفر کی کہ وہ مجھے ریستورنٹ جاتے ہوئے ”کنگسٹن (Kingstone)“ یونیورسٹی چھوڑتا جائے گا۔ لیکن میں نے اُسے بتایا کہ میں تنہا ہی گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک گھر سے نکل جاؤں گا، وہ ریستورنٹ چلا جائے۔ ویسے بھی اُسے صبح جلدی پہنچ کر اپنے کاروبار کا آغاز کرنا ہوتا تھا۔ اور میرا اتنی صبح گھر سے نکلنے کا قطعی کوئی موڈ نہ تھا۔ اور پھر لندن میرے لیے کبھی بھی اجنبی نہیں رہا تھا۔ ایک عجیب سی اُنسیت اور اپنا پن تھا میرے لیے اس شہر میں، شاید اس کی ایک وجہ اس کے موسم کی میرے آبائی شہر کوئٹہ کے موسم سے مماثلت بھی ہو سکتی تھی۔ نہ صرف موسم بلکہ پُرانے لندن میں جہاں اب تک تقسیم ہند سے پہلے وقتوں کی عمارتیں اور تعمیرات موجود تھیں ان میں سے بعض کی بناوٹ تو ہو ہو 1935ء کے زلزلے سے پہلے والے کوئٹہ کی عمارات کی طرح ہے۔ بنیادی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ کوئٹہ تقسیم ہند سے قبل خود برٹش ایمپائر کی بہت بڑی چھاؤنی رہ چکا تھا اور اسے آباد کرتے وقت انگلش ہنر کاروں نے فن تعمیرات میں اینٹ کا رخ، عمارت کی بیرونی اٹھان اور طویل اور چوڑی سڑکوں کی کشادگی دیتے وقت شاید لندن ہی کو ذہن میں رکھا ہوگا۔ اور پھر صرف میرے شہر پر ہی کیا منحصر ہے۔۔۔۔ تقسیم سے قبل انگریز جن علاقوں میں بھی رہا (خاص کر سرد علاقے) وہاں کی طرز تعمیر

رنگ نچوڑ لیے ہوں۔ یہ من سے من کا کیسا ناٹھ ہوتا ہے کہ سینکڑوں کی بھیڑ کسی ایک کی وجہ سے اپنی سی لگنے لگتی ہے۔ اور پھر یہاں تو قصہ ہی یک طرفہ تھا، جو بھی طوفان اٹھ رہے تھے وہ صرف میرے من میں تھے۔ ایمان تو اس سب سے بالکل بے خبر تھی۔ اگر لوگ جسے محبت کہتے ہیں، وہ اسی جذبے کا نام تھا جو اس وقت میرے خون کے ساتھ گردش کر رہا تھا تو کیا یہ محبت اس قدر زور آور ہو سکتی تھی کہ وہ صرف یک طرفہ ہو کر بھی کسی انسان کی زندگی کے بھی انداز۔۔۔۔ بھی اطوار بدل کر رکھ دے۔۔۔۔؟

لڑکی مجھے دیکھ کر مسکرائی اور سر کے اشارے سے مجھے سلام کیا۔ وہ اس وقت گٹار پر ایک مشہور ہسپانوی گیت کی دھن بجا رہی تھی جس کے بول کچھ یوں تھے کہ ”میرے محبوب۔۔۔۔ اک تمہارے جانے کے بعد۔۔۔۔ ہر منظر اُداس ہے۔۔۔۔ ہر شہر دیران ہے۔“

میں نے حیرت سے اس گٹار بجانے والی لڑکی کو دیکھا۔۔۔۔ اُسے میرے دل کے حال کا کیسے پتہ چل گیا۔۔؟۔۔ شاید محبت کو کھودینے کے تجربے سے گزرنے والے سبھی چہروں کی تحریر ایک سی ہی ہوتی ہے۔ میرا ہاتھ جیب میں گیا اور واپسی پر جتنے بھی سکے اس ہاتھ میں آئے، وہ سبھی میں نے لڑکی کے گٹار میں ڈال دیے اور خود آگے بڑھ گیا۔

سب دے میں زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ زمین دوزریلوے اسٹیشن مختلف روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ اور اٹکا دکا لوگ ٹرین کے انتظار میں کھڑے تھے، بھیڑ نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت دن کے ساڑھے گیارہ بجے تھے اور یہ وقت دفتری اوقات کا کارخانہ تھا۔ ٹرین اپنے مقررہ وقت پر ایک مخصوص سی گرج کے ساتھ سب دے میں داخل ہوئی۔ خود کار دروازے کھل گئے اور ہم سب مسافر اس میں داخل ہو گئے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ انسان نے انسان کی آسانی کے لیے کیسی کیسی ایجادات کی ہیں۔ ہماری زندگی کا شاید ننانوے فیصد سکھ دوسروں کی تیار کردہ ایسی ہزاروں چیزوں کا مرہون منت ہوتا ہے، سوئی سے لے کر ہوائی جہاز تک سبھی کچھ جو ہمارے روزمرہ کے استعمال میں آتا ہے۔ وہ سبھی کوئی اور ہمارے لیے بنا کر گیا ہے۔ ہم صرف چند سیکے خرچ کر کے ان ایجادات کے آرام و سکون کے حق دار بن سکتے تھے۔ شاید اسی بات نے ان سکون کے حصول کو اس قدر مشکل بنا دیا ہے۔۔۔۔۔

لیکن سکون کا حصول صرف ان سکونوں سے ہی تو مشروط نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ دل کا سکون کائنات کی ایک ان مول کیفیت ہے۔ اور اس بات کا صحیح اندازہ صرف وہی لگا سکتا ہے جس کے اپنے دل کا سکون ٹٹ چکا ہو۔ ہم انسان بھی کتنے نادان ہوتے ہیں، جب تک دل کا قرار اپنے قابو میں ہوتا ہے۔ ہم اسے بازاروں میں ٹٹ جانے کے لیے پھرتے ہیں، ہر طرف اٹھتی نگاہ کا بس ایک ہی حاصل ایک ہی منزل ہوتی ہے۔۔۔ کوئی دلبر۔۔۔۔۔ کوئی محبوب۔۔۔۔۔ اور جب وہی دلبر ہم سے ہمارا چین و سکون لے اڑتا ہے تو پھر ہم اس کی ہی دھائی

میں جب تک گھر سے نکلا تو اچھی خاصی دھوپ نکل چکی تھی۔ برف صاف کرنے والی مشین نے سڑکوں سے برف ہٹا کر کناروں پر کر دی تھی۔ برف باری کے بعد نکلنے والی دھوپ بے حد چمک دار ہوتی ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے قدرت کے ان دیکھے ہاتھ نے آس پاس کی سب چیزوں پر قلعی سی پھیر دی ہے۔ مخصوص رنگ کی پکی اینٹوں سے بنی سڑک متماسی رہی تھی۔ لوگوں کے چہروں پر بھی ایک خاص سی چمک تھی۔ یہ موسم بھی ہم انسانوں کی طبیعت پر کس کس طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اچھے بھلے انسان کو پل میں خوش یا اُداس کر دیتے ہیں۔ بلا کسی بھی وجہ کے، لیکن میرے لیے تو جیسے ہر موسم میں اُداسی ہی اتر آئی تھی۔ سولندن بھی مجھے اُداس لگ رہا تھا، چمکتی دھوپ کے باوجود، آس پاس کھلے ہوئے سے چہروں کی موجودگی میں بھی ایک گہری اُداسی تھی۔

گھر سے نکل کر میں پیدل ہی تیسری گلی کے سب وے کی جانب چل پڑا۔ دھوپ کی چمک نے مجھے آنکھوں پر گہرا کالا دھوپ کا چشمہ پہننے پر مجبور کر دیا۔ کاش انسان ایسے گھر سے رنگوں کے چشمے بھی بنایا تا جو دکھوں کی آنکھوں کو خیرہ کرتی دھوپ کو بھی روک سکتے۔۔۔۔۔

گلی کے اختتام پر ایک اسپینش (Spanish) لڑکی گٹار پر کوئی دھن بجا رہی تھی۔ اس کے سامنے اسی گٹار کا بڑا سا کالا کیس Case رکھا ہوا تھا جس میں آتے جاتے لوگ چند لمحے گٹار کی دل کو چھو لینے والی دھن سننے کے بعد چند سکنے ڈال کر آگے بڑھ جاتے، مانگنے کا کس قدر آبرو مندانہ طریقہ تھا یہ۔ کچھ لوگ مانگتے بھی یوں ہیں کہ دینے والے کو ان کا حق لگتا ہے، اور کچھ لوگ اپنا حق بھی کچھ ایسے انداز میں وصول کرتے ہیں کہ دینے والا بھیک کی طرح

دیتے پھرتے ہیں۔

انہی اُلٹے سیدھے خیالات کی یورش میں مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب ٹیوب ٹرین میرے مطلوبہ سب وے اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ اور کب رکی۔ یہ تو اچھا تھا کہ آخری چند لمحوں میں سامنے جگمگاتے ہوئے نیون سائن پر میری نظر پڑ گئی جس پر 17 ڈاؤنگ سٹریٹ کا ہندسہ جگمگا رہا تھا۔ مجھے جیسے ہوش سا آ گیا اور میں ٹرین کے دروازے بند ہونے سے قبل ہی نیچے اتر آیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی سڑک تک پہنچا۔ اب یہاں سے 9 نمبر کی لندن کی مشہور و مخصوص سرخ ڈبل ڈیکر بسوں میں سے ایک بس مجھے سیدھا یونیورسٹی کے گیٹ تک پہنچا سکتی تھی۔

لندن بالکل ویسا ہی تھا جیسے میں اسے دو سال پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ اس بس اسٹاپ کے بالکل سامنے بوڑھا برگد کا درخت اب بھی دیے ہی کھڑا مسکرا رہا تھا جیسے مجھے پھر سے خوش آمدید کہہ رہا ہو۔ انگریز ایسی باتوں کا بہت دھیان رکھتے ہیں۔ صرف اس درخت کو بچانے کے لیے انہوں نے چند سال پہلے اپنے ماسٹر پلان کے نقشے میں یہاں سے گزرتی سڑک کا رخ موڑ دیا تھا کیونکہ اگر سڑک لندن ماسٹر پلان کے تحت بنتی تو اس درخت کا کٹنا لازمی تھا، لیکن انگلش ایک روایت پرست اور ماضی پرست قوم ہے۔ وہ اپنی یادوں کو، اپنی تاریخ کو اتنی آسانی سے مسخ نہیں ہوتے دیتے، بلکہ اُسے بچانے کے لیے جان لڑا دیتے ہیں۔ شاید اسی لیے اس قوم نے برسوں اس دنیا پر راج کیا ہے۔ سچ ہے۔۔۔ تو میں یونہی نہیں بن جاتیں، اس کے پیچھے صدیوں کی تربیت اور حوادث کا عمل دخل ہوتا ہے۔

کچھ ہی لمحوں میں میری مطلوبہ سرخ ڈبل ڈیکر بس دھیمی سی رفتار سے چلتی ہوئی بس اسٹاپ پر آ کھڑی ہوئی اور میں بس میں سوار ہو گیا۔ یونیورسٹی کے راستے میں میرا پرانا دوست، میرا ہم راز اور میرا مہربان دریا، دریائے ٹیمز (River Thames) پڑتا تھا۔ میرے لڑکپن کی کئی شامیں اور جوانی کی کئی راتیں اس دریا کے کنارے لگے ہوئے خوبصورت لکڑی کے پیٹھوں پر گزری تھیں۔ وہ پل، جنہیں اب میں یاد کر رہا تھا تو جیسے سب اک خواب سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دوستوں کے ساتھ پک نکس وہ نئے نئے فلرٹ، وہ کچی محبتیں، ٹیمز کا پانی مجھے دیکھ دیکھ کر مستی میں ہلکورے لے رہا تھا جیسے وہ میری لندن آمد سے

بہت خوش ہو، بس دریا کے ساتھ بنی ہوئی چوڑی سی سڑک پر بڑھ رہی تھی اور دریا ہمارے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی پُرانے محلے میں جب کوئی چچماتی کار یا بڑی گاڑی داخل ہوتی ہے تو محلے کے بچے اس گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہیں۔ ہمارے آس پاس کے موسم، درخت عمارتیں اور اس جیسے دریا، یہ ہمیں کس کس روپ میں دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ ہنستے ہوئے۔۔۔۔۔ کبھی روتے ہوئے۔۔۔۔۔ خوشی، غم۔۔۔۔۔ غرض ہماری زندگی کا کون سا پہلو ہے جو ہمارے ارد گرد بستے اس ماحول سے پوشیدہ ہوتا ہے، شاید اسی لیے ہمیں ایسا لگتا ہے کہ یہ بھی ہمارے ساتھ ہی خوش ہوتے ہیں اور ہمارے ساتھ ہی روتے ہیں، شاید ہر موسم ہمارے اندر کے موسم سے جڑا ہوتا ہے۔

بس یونیورسٹی کے دروازے پر آ کر رک گئی۔ میرا اسٹاپ آ گیا تھا۔ میں یونیورسٹی کے عظیم الشان آہنی جنگلے کے گیٹ سے اندر بنی اینٹوں کی سڑک پر آ گیا۔ یہ بہت بڑے گھاس کے دالانوں پر مشتمل ایک ایسی عمارت تھی جس کے اندر سے دریائے ٹیمز کی ایک چھوٹی سی شاخ گھاس کے عظیم میدانوں کو سیراب کرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ دور دور تک بہت بڑے بڑے اور اونچے درخت ایستادہ تھے، جو اس وقت رات کی برف باری کی وجہ سے دور سے سفید لباسوں میں ملبوس بوڑھے بزرگوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ دریا کے پانی کے اوپر شفاف برف کی ایک سل نما تہہ بچھی ہوئی تھی جس کے نیچے دریا کا پانی بہتا صاف دکھائی دے رہا تھا۔

یونیورسٹی کی مرکزی عمارت سفید سنگ مرمر سے بنی ہوئی تھی اور برف کے اس ماحول میں اس کے اونچے لمبے ستون اور باقی عمارت بھی برف ہی سے بنی دکھائی دے رہی تھی۔ ایڈمن ڈیپارٹمنٹ پے فارم لے کر میں نے بھر دیے تھے اور میری کلاسز دو دن کے بعد سے شروع ہونا تھیں۔ پتہ چلا کہ ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ایک یہودی نثر ادب سٹرک ہیں جو خود یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہیں۔ میں ان سے بھی ملنا چاہتا تھا لیکن پتہ چلا کہ وہ صبح گیارہ بجے کی کلاس کے بعد شہر میں ہونے والی کسی تعلیمی تقریب میں چلے گئے ہیں جس میں وہ بطور مہمان خصوصی مدعو تھے۔ میرا اب یونیورسٹی میں مزید ٹکنے کا کوئی جواز نہیں تھا لہذا میں اسی راستے سے واپسی کی بس لے کر سب وے تک پہنچ گیا۔ دوپہر کے ڈھائی بج چکے تھے اور یہ

گے۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے۔ انسان بہترین معاشرتی جانور ہے۔

○○

گھر واپس پہنچنے تک شام ہو چکی تھی۔ سورج ڈھل رہا تھا، گلی کے پچھواڑے وہی کل والے شرارتی بچے پھر سے جمع تھے اور اپنے کل کے بنائے ہوئے برف کے پتلے کی باقیات سنبھالنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ سردیوں کی شام کی دھوپ پلک جھپکتے ہی کسی ستم گر محبوب کی طرح آنکھیں پھیر لیتی ہے۔ ہوا میں خنکی کی مقدار بڑھتی جا رہی تھی، لوگوں نے اپنے اور کوٹس کے کالر اوپر چڑھا لیے تھے اور سانس لیتے اور بات کرتے وقت ان کے ہونٹوں سے بھاپ نکلتی دکھائی دیتی تھی۔ گٹار بجانے والی لڑکی نے اپنا گٹار اپنے بکس میں رکھ دیا تھا اور اب وہ بھی روانگی کے لیے تیار تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں مانوسیت کی ایک چمک لہرائی۔ وہ ہلکے سے مسکرائی اور میں سر کے اشارے سے اسے سلام کرتا آگے بڑھ گیا۔ رات کا مران بھی جلد ہی واپس آ گیا تھا اور ہم نے سڑک کے کنارے دوسرے بلاک کے ایک چھوٹے مگر سکون سے ریستورنٹ میں کھانا کھانے کا پروگرام بنالیا تھا۔ اور اب ہم اسی ریستورنٹ کے ایک گوشے میں اپنی ٹیبل کے گرد بیٹھے سوپ کی چسکیاں لے رہے تھے۔ کامران نے آس پاس بیٹھی لڑکیوں اور خواتین کا بغور جائزہ لینے کے بعد اپنی حتمی رائے صادر کر دی تھی۔ اپنے زریں خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ بولا ”مرد عورتوں سے اس امید پر شادی کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ ویسے ہی رہیں گی جیسے وہ شادی کے وقت ہوتی ہیں۔ اور عورتیں مردوں سے اس امید میں شادی کرتی ہیں کہ شاید وہ شادی کے بعد بدل جائیں گے۔ لیکن افسوس، بعد میں دونوں کو ہی مایوسی ہوتی ہے۔

میں نے غور سے اُسے دیکھا ”شاید اسی لیے تم نے اب تک شادی نہیں کی۔“ کامران مسکرایا، ”خیر میری بات چھوڑو۔ تم یہ بتاؤ آج یونیورسٹی میں دن کیسے گزرا۔“ میں نے نیپکن میز سے اٹھا کر اپنے ہونٹ خشک کیے۔ ”کچھ خاص نہیں۔ بس فارم ہی بھر سکا، ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہ موجود نہیں تھے۔“

کامران بولا۔ ”تم مسٹر آنر کی بات کر رہے ہو۔ آج کل اخبارات میں اس کا بڑا تذکرہ رہتا ہے۔ مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ اس جیسے کٹر یہودی نے ایک پاکستانی

دفتری اوقات کے مطابق دن کے کھانے کا وقت تھا۔ لہذا سب دے میں بھی صبح کی نسبت زیادہ چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے فی الوقت بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی، لیکن پھر بھی میں کافی اور ایک سینڈوچ کالنج کرنے قریبی ریستوران میں داخل ہو گیا۔ قدرت نے ہم انسانوں کو ان کی کم مائیگی اور بے بسی کا احساس دلانے کے لیے اس دنیا میں جن اور بہت سی چیزوں کا اہتمام کر رکھا، وہیں بھوک بھی ان مجبوریوں میں سے ایک ہے، بڑے سے بڑا قد آور اور شبہ زور اس مجبوری کے آگے بے بس ہے۔

اور عزیز سے عزیز ترین رشتہ بھی بھوک کے اس احساس کو مٹا نہیں سکتا۔ ہم اپنے آس پاس روز کیسے کیسے دلداروں کو جان سے زیادہ عزیز رشتوں کو خود سے جدا ہوتا اور مرتا ہوا دیکھتے ہیں۔ ان سے جڑے بے بس انسان جو اس لمحے خود کو بھی مٹا محسوس کر رہے ہوتے ہیں۔ جن کی بھوک پیاس سب ختم ہو چکی ہوتی ہے، جنہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس بے جان جسم کے ساتھ ان کا لاشہ بھی قبر میں اتار دیا گیا ہے اور اب وہ کبھی اس جیتی جاگتی دنیا کے ساتھ چل نہیں پائیں گے۔ جن کا ہر احساس اس لمحے مٹی ہو چکا ہوتا ہے۔ لیکن 24 یا 48 گھنٹوں کی مختصر مدت کے بعد ہی یہ معدہ انسان کو اس کی کم ظرفی، بے بسی اور مجبوری کا احساس دلانے کے لیے جاگ اٹھتا ہے، بھوک اسے ستانے لگتی ہے۔

انسان اپنے اندر اپنے آپ سے ہی نفرت اور شرمندگی محسوس کرنے لگتا ہے کہ ابھی چند گھنٹوں پہلے ہی تو وہ اپنے اندر کتنے بڑے بڑے دعوے کر رہا تھا۔ مٹی کے ساتھ مٹی میں مل جانے کے دعوے، سب تیاگ دینے کے دعوے، لیکن سچ یہ ہے کہ انسان سے زیادہ بے بس مخلوق بھی دوسری اور کوئی نہیں۔ ہاں البتہ ایسے موقعوں پر اسی کے جیسے دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے خود ساختہ اصول اس کے کام آ جاتے ہیں اور شرم کا کچھ پردہ رہ جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے ”میت کے گھر تین دن تک کھانا نہیں کپے گا، بھلا اس سوگ میں ان بے چاروں کو کھانے پینے کا ہوش ہی کہاں ہوگا؟ دوسرا کہتا ہے، ہاں ہاں ٹھیک ہے، پہلے دن کا کھانا تو ہمارے گھر سے ہی آئے گا، دوسرا دوسرے دن کا اور کوئی تیسرا تیسرے کا وعدہ کر کے وہاں سے اٹھ آتے ہیں۔ وہ سب جانتے ہیں کہ کل جب ان کے گھر میں یہ ماتم ہوگا تو تب بھی یہی سب اس کی دلجوئی کو وہاں موجود ہوں گے۔ اس کی شرم کا پردہ رکھنے میں اس کی مدد کریں

مسلمان کو اپنی یونیورسٹی میں داخلہ کیسے دے دیا اس سے ذرا بچ کر ہی رہنا۔“ مجھے کامران کی بات سن کر ہنسی آ گئی۔ ”کیوں۔۔۔ کیا وہ آدم خور ہے جو مجھے کھا جائے گا؟“

کامران سنجیدہ تھا، ”تم ان یہودیوں کی طبیعت سے واقف نہیں ہو شاید۔ یہ کبھی بھی دل سے مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں ہوئے۔ اور اس کا اندازہ ہم جیسے دیار غیر میں بھٹکتے ہوئے مسلمان ہی ٹھیک لگا سکتے ہیں۔ جنہیں ہر بزنس کے معاملے میں ان یہودیوں کی نفرت اور مقابلے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ فی الحال ان یہودیوں نے ہمیں بزنس کے معاملے میں مکمل بات دے رکھی ہے۔“

میں نے سوال کیا، ”لیکن تم لوگوں نے اور یہاں کی دوسری بزنس کمیونٹی نے کبھی ان وجوہات پر غور کیا ہے جو ان یہودیوں کی تجارتی کامیابیوں کا راز ہیں۔“

کامران نے گہری سی سانس لی۔ ”بات بالکل صاف ہے۔ یہودی کبھی تلخ کلامی سے کام نہیں لیتا، اور بزنس کا پہلا اصول ہی خوش اخلاقی ہے۔ سخت سے سخت حالات میں بھی اس کے ہونٹوں سے چپکی مخصوص مسکراہٹ کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ دوسری اہم وجہ ہے ایک یہودی کا دوسرے یہودی تاجر کا خیال رکھنا چاہیے دو یہودی تاجر آپس میں بدترین اور جانی دشمن بھی کیوں نہ ہوں، لیکن اگر ان کا کلائنٹ کوئی ایسی چیز طلب کرتا ہے جو پہلے یہودی کی دکان پر میسر نہ ہو، تب بھی وہ خود پیدل چل کر اس خریدار کو اس جانی دشمن یہودی کے پاس لے کر جاتا ہے جہاں اسے وہ ضرورت کی چیز مل سکتی ہو۔ یہودی کبھی کسی غیر یہودی کو متعارف نہیں کرواتا۔ یہی اس یہودی تجارت کے پینے کا راز بھی ہے۔“

میں کامران کے خیالات سے کسی حد تک متفق بھی تھا لیکن میرے خیال میں اس نے یہودی تاجروں کی سب سے بڑی معصومیت کا تذکرہ اب تک نہیں کیا تھا۔

”تم سب سے اہم خصوصیت کا تذکرہ کرنا بھول گئے ہو۔ وہ ہے ایمان داری۔۔۔۔۔“

یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے تاجر اتنے خوش اخلاق اور ٹھنڈے مزاج کے نہیں ہوتے۔۔۔۔۔ یہ بھی درست ہے کہ ہم ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے سے بھی کبھی باز نہیں آتے۔ ہمارا اصول ہے کہ اپنا فائدہ ہونے ہو۔۔۔۔۔ لیکن دوسرے کا نقصان ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن ان سب سے زیادہ بڑی وجہ ہے بے ایمانی۔ اور یہودی تجارت میں بے ایمان نہیں ہوتے۔۔۔۔۔ میرے

خیال میں ان کی کامیابی کا اصل راز یہی ہے۔“

ہم دونوں کھانا کھا چکے تھے اور اب پیدل ہی واپس اپارٹمنٹ کی طرف روانہ تھے۔ کرسس کا تہوار قریب آ رہا تھا لہذا آس پاس خریداروں کی چہل پہل بڑھتی جا رہی تھی۔ جا بجا کرسس کے نمائشی درخت مخصوص جلتے بجھتے ققمیوں سے سجے جھلملا رہے تھے۔ لوگ سردی سے بے نیاز ہو کر خود کو گرم کپڑوں سے ڈھکے ہوئے۔ آس پاس کی جگمگ کرتی دکانوں سے خریداری کر رہے تھے۔ شاید دنیا کا ہر تہوار ایک سا ہی ہوتا ہے۔ کبھی تہواروں کا تعلق دل کی خوشی سے ہوتا ہے۔ اور کبھی تہواروں کے اصل شوقین بچے ہوتے ہیں۔ شاید اسی لیے اس وقت بھی لندن کے اس بارونق بازار میں زیادہ تر تعداد بچوں کی ہی تھی۔ مجھے یاد ہے جب ہم چھوٹے تھے تو عید کی رات یا چاند رات سے کئی راتیں قبل ہی ہماری نیند جیسے اڑ ہی تو جاتی تھی۔ اور عید کی رات تو آنکھوں ہی آنکھوں میں صبح ہو جاتی تھی۔ عیدی ملنے کی خوشی اور پھر اس سے بھی زیادہ اس عیدی کو خرچ کرنے کی خوشی۔ لیکن عید کا پورا دن ہاتھ سے یوں نکل جایا کرتا تھا جیسے بند مٹھی سے ریت۔ شاید چیزوں یا تہواروں کی خوشی کا تعلق ان کی کمیابی اور تھوڑے ہونے سے بھی وابستہ ہوتا ہے۔ آس پاس پھرتے لوگوں کے چہروں سے خوشی ٹپک رہی تھی۔ یہ چہرے بھی کیسا آئینہ ہوتے ہیں۔

گھر پہنچتے ہی کامران بستر میں گھس گیا کیونکہ اسے اگلی صبح جلد نکلنا تھا، آج اس نے ایمان کے موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ ہم دونوں بچپن سے ایک دوسرے کی عادتوں سے خوب واقف تھے۔۔۔۔۔ وہ جانتا تھا کہ میں جب سنبھل جاؤں گا تو خود ہی اسے سب بتا دوں گا، اس سے پہلے مجھ سے کچھ پوچھنا فضول ہے۔ میں نے لائٹ بند کرنے سے پہلے بستر کی سائڈ ٹیبل پر رکھے رسالوں کی ورق گردانی کی تاکہ کام کوشش کی لیکن پھر آخر کار جتنی بھجادی، لیکن کمرہ اندھیرا ہوتے ہی دماغ کے درتچے روشن ہو گئے۔ یادیں بڑی ہوں یا بھلی، دونوں صورتوں میں یادِ ماضی عذاب ہی تو ہے۔

پکڑے، ”ہوں۔۔۔ تو یہ بات ہے۔ دو پہر کو ماما سے چھپ کر پکنک منائی جا رہی ہے۔“
سنی ہنسا ”نہیں چاچو۔ ماما تو دادی کے ساتھ کب کی شاپنگ کے لیے جا چکی ہیں۔ یہ
سب کچھ تو ہم مولوی صاحب کے لیے لے جا رہے ہیں۔“ مولوی صاحب کا نام سنتے ہی
میرے کان کھڑے ہو گئے۔ ”کیا مطلب؟ کیا مولوی صاحب کو ڈاکٹر نے بخار میں پیٹ بھر
کر آکس کریم کھانے کا کہا ہے؟“

سنی ہنس پڑا، ”افو۔۔۔ چاچو آپ بھی۔۔۔؟“ مولوی صاحب کے لیے تو ہم یہ پھل
لے کر جا رہے ہیں۔ آکس کریم تو ایمان آپنی اور حیا باجی کے لیے ہے۔۔۔ اب سمجھے۔“
اتنے میں شاکر گڑ گڑایا۔ ”حماد بابا۔۔۔ اب آپ ہی سمجھاؤ ناسنی میاں کو۔۔۔ اگر سجاد
میاں کو پتہ چلا تو وہ بہت ناراض ہو جائیں گے۔ لیکن یہ سنی میاں تو مستقل ضد کیے جا رہے
ہیں۔ گھر میں اس وقت کوئی دوسرا بڑا بھی نہیں، جس نے ہم اجازت لے سکیں۔“
سنی نے منہ بسورا ”مولوی صاحب نے ہمیں پڑھایا ہے کہ جب کوئی بیمار ہو تو اس کی
میادیت کے لیے جانا چاہیے۔ اس سے ثواب ملتا ہے۔ پھر ثواب کے کام کے لیے کسی سے
پوچھنے کی کیا ضرورت؟۔۔۔ ہے نامیڈی چاچو۔“

پھر جیسے کسی خیال سے سنی کی آنکھیں اپنے آپ ہی چمکنے لگیں۔ اُس نے میرا ہاتھ تھام
لیا۔ ”آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں نامیڈی چاچو۔ ہم جلدی واپس آ جائیں گے۔“ میرا دل
اچھل کر حلق میں آ گیا۔ یوں لگا جیسے سنی نے میرے دل کی بات پڑھ لی ہے۔ شاکر نے بھی
نوراسنی کا ساتھ دیا۔ ”ہاں حماد بابا۔۔۔ آپ ساتھ چلیں گے تو میری بھی کچھ بچت ہو جائے
گی۔ ورنہ آپ سجاد میاں کے غصے سے تو واقف ہیں۔“

اب تو سنی نے باقاعدہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا۔ نتیجتاً ہم تینوں گاڑی میں سوار
ہو گئے اور جاتے ہوئے گیٹ پر دربان کو شاکر نے بتا دیا کہ سنی اپنے میڈی چاچو کے ساتھ
کہیں گھومنے جا رہا ہے۔ گھنٹہ بھر میں واپس آ جائیں گے نہ شاکر نے جان بوجھ کر شاید مولوی
صاحب کے گھر کا تذکرہ نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ میرے گھر والے ایسی باتوں کو سخت ناپسند
کرتے ہیں۔ وہ امیروں اور غریبوں کے درمیان فاصلے کے قائل ہیں۔ لیکن سنی کا معصوم
امین ابھی تک زمانے کی ان منافقانہ ترکیبوں سے کوسوں دور تھا۔ رہی میری بات، تو مجھے

ایمان

سنی کے پہلے پارے کی دُعا یہ تقریب تو گزر گئی لیکن اس کے بعد جیسے میرے شب و
روز ہی بدل گئے۔ میں خود جان نہیں پا رہا تھا کہ یہ بے چینی کیسی ہے۔۔۔ سب کچھ میسر
ہونے کے باوجود میں اس قدر تہی دست اور بے بس سا کیوں ہوتا جا رہا ہوں۔ دل کہیں بھی تو
نہیں ٹپک پاتا تھا۔ بھیڑ میں ہوتا تو لوگوں سے دور بھاگتا، تنہا ہوتا تو گھبرا کر نیچے لاؤنچ میں جا
بیٹھتا۔ مولوی صاحب کی بیماری نے بھی طول پکڑ لیا تھا۔ پتہ چلا کہ اس دن کی بے آرا می کی
وجہ سے بخار زور پکڑ گیا تھا۔ لہذا اگلا پورا ہفتہ وہ سنی کو درس دینے نہ آ سکے۔ اور جانے مجھے ایسا
کیوں لگ رہا تھا جیسے ان کے نہ آنے سے میری کوئی بہت اہم اور بہت قیمتی چیز مجھ سے دور
ہوتی جا رہی ہے۔

یہ اسی ہفتے کی ایک گرم سہ پہر کی بات ہے۔ میں گھر کے دالان میں پیڑوں کے نیچے
ڈلی ہوئی آرام کرسیوں میں سے ایک پر آنکھیں موندھے پڑا ہوا تھا۔ گرمیوں کی دو پہریں
بھی کتنی لمبی ہوتی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے سورج ایک ہی جگہ ٹک کر رہ گیا ہے یا شاید مجھ جیسے
شوریدہ سروں کو ہی ان کی بے جا طوالت سے اختلاف تھا، جن کے دلدار کہیں بستے ہوں گے
شاید وہ ان سے لمبی ملاقات کے لیے ایسی سہ پہروں کی دُعا میں مانگتے نہ تھکتے ہوں۔۔۔
میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اندر سے سنی میاں شاکر ڈرائیور کے ساتھ شور مچاتے
اور اُچھلتے کودتے برآمد ہوئے۔ شاکر کے ہاتھ میں دو بڑے بڑے تھرماس تھے اور سنی کے
ہاتھوں میں پھلوں سے بھری ٹوکری۔ سنی نے مجھے دالان میں دیکھا تو بھاگ کر میرے پاس
آیا۔

”چاچو۔۔۔ دیکھیں میں نے کتنی بہت سی آکس کریم جمع کی ہے۔“ سنی نے شاکر کے
ہاتھوں میں پکڑے جہازی سائز کے تھرماسوں کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے سنی کے کان

ہمارے لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی انہوں نے جانے اندر جا کر کیا کھسر پھسر کی کہ چند لمحوں میں ہی باہر کسی طرف بنے نعمت خانے سے مختلف اشتہا انگیز خوشبوؤں اور مہک کے ساتھ ساتھ چوڑیوں کی ہلکی سی کھنک اور برتنوں کے کھڑکھڑانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے مولوی صاحب کو روکا۔

”آپ کوئی تکلف نہ کریں، ہم بنا بتائے ہی گھر سے نکل آئے ہیں وہاں سنی کی مہمان پریشان ہوتی ہوں گی۔“

مولوی صاحب پر کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ ”میاں غریب کی مہمان نوازی کیا اور اس کا تکلف کیا؟“

معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کی دو ہی صاحب زادیاں ہیں۔ کوئی زینہ اولاد نہیں تھی۔ البتہ ان کے مرحوم بڑے بھائی کا ایک بیٹا تھا جو بچپن سے مولوی صاحب کے یہاں ہی پلا بڑھا تھا، عبد اللہ صرف نام کا ہی عبد اللہ نہ تھا۔ بلکہ اپنے اعمال سے بھی اس نے اپنے آپ کو مولوی علیم کا صحیح معنوں میں جانشین ثابت کیا تھا۔ وہ انہی کی تربیت کا نقش ثانی تھا۔ مولوی صاحب جس مسجد میں نماز پڑھاتے تھے۔ وہیں عبد اللہ ہی ہمیشہ ان کی تکبیر دیتا تھا۔ بلکہ اب تو زیادہ تر مولوی صاحب کی طبیعت خراب رہنے کے باعث عبد اللہ ہی محلے کی مسجد میں اذان دیا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ مجھے آس پاس کہیں دکھائی نہ دیا۔ کچھ دیر بعد اندر کے دروازے کی طرف سے ہلکی سی آہٹ ہوئی جیسے کوئی دروازے پر آ کر رکا ہو۔ مولوی صاحب جلدی سے اٹھ کر دروازے سے اندر چلے گئے۔ کچھ چوڑیاں کھٹکنے کی آواز اور دبی سی چند سرگوشیاں سنائی دیں اور مولوی صاحب ایک ایک کر کے تین چار خوان اندر اٹھالائے۔ میں اور شا کر بس ”ارے، ارے“ ہی کرتے رہ گئے۔ چند منٹوں میں ہی ان لوگوں نے کیا کچھ اہتمام کر لیا تھا۔ شام کی چائے کے ساتھ جو کچھ بھی لوازمات ہو سکتے تھے۔ وہ سب کے سب حاضر تھے۔ گھر کا بنا ہوا پیر کیک، سمو سے، املی کی چٹنی، زعفران سے بچی بالائی، گاجر کا حلوہ اخروٹ سے بنی ہوئی مٹھائی اور جانے کیا کیا۔۔۔؟

میرے ساتھ بچپن سے ہی ایک عجیب سا مسئلہ تھا، میں کسی کے سامنے کچھ کھاتے۔ اے بے حد شرم محسوس کرتا تھا۔ اور خاص طور پر اگر کوئی اجنبی سامنے بیٹھا ہو تو مجھ سے کچھ

آخری حصے میں لکڑی کی جالیوں (جافریوں) کی پارٹیشن میں ایک دروازہ کھلتا تھا۔ مولوی صاحب مجھے اسی طرف لیے بڑھ گئے۔ شاید یہی اس چھوٹے سے گھر کا مہمان خانہ یا بیٹھک بھی تھی۔ بیٹھک والے برآمدے کے حصے کو اندر سے بھی لکڑی کی جالی نما پارٹیشن سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ میں بے خود اور سحر زدہ سا مولوی صاحب کے پیچھے پیچھے سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ اندر سے سنی کے زور زور سے بولنے اور ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں، انہی آوازوں میں ایک آدھ نسوانی ہنسی اور باتوں کا جلت رنگ بھی شامل تھا۔ میری تو جیسے سانس ہی رکنے لگی تھیں۔ وہ مختصر سی بیٹھک یا ڈرائنگ روم گھر والوں کی نفاست کی آئینہ دار تھی۔ مختصر سا پُرانا فرنیچر، سلیتے سے کڑھے ہوئے پوش (کورز) سے ڈھکا ہوا تھا۔ سامنے کارنس پر غالب کا دیوان اور چند دوسرے مشہور مصنفین کی کتابیں اور نقوش رسالے کے چند ایڈیشن سلیتے سے سجے ہوئے تھے۔ لگتا تھا گھر کے مینوں کو اردو ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ میرا ذہن پھر سے بھٹکنے لگا۔ جانے کتنی بار اس کی مخروطی انگلیوں نے ان کتابوں کے ورق پلٹے ہوں گے؟ دن میں جانے کتنی بار وہ یہاں آتی ہوگی۔ اور کون جانے وہ گھنٹوں یہاں اسی جگہ بیٹھی ان کتابوں کی ورق گردانی کرتی ہوگی جہاں میں اس وقت بیٹھا ہوا تھا۔ مولوی صاحب کے لہجے میں اب بھی معذرت تھی۔

”میاں یہ آپ نے بڑی زیادتی کر دی۔۔۔۔۔ پہلی مرتبہ اس غریب خانے پر تشریف لائے اور یوں دروازے پر ہی کھڑے رہے۔۔۔۔۔ یہ گھر آپ کے قابل تو نہیں لیکن۔۔۔۔۔“ میں نے جلدی سے ان کی بات کاٹ دی۔

”یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں تو بس یونہی۔۔۔۔۔“ شا کر نے جلدی سے بات بنائی۔ ”حماد بابا کا خیال تھا کہ ہم دروازے سے ہی سامان دے کر لوٹ آئیں گے۔“ مولوی صاحب نے ناراضگی سے شا کر کی طرف دیکھا۔

”بھئی تم تو ہم سے کوئی بات نہ ہی کرو شا کر بھیا۔ پہلی مرتبہ صاحبزادے اس گھر تک آئیں اور ہم انہیں دروازے سے ہی لوٹا دیں۔ یہ کہاں کی روایت ہے بھلا۔“ مولوی صاحب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہمارے لیے بچھ بچھ جائیں۔ جانے یہ پُرانے طرز کی روایتی وضع داری ہم جیسے امیروں کی بڑی بڑی کوٹھیوں اور حویلیوں سے کہاں غائب ہوتی جا رہی تھی۔

لگنا محال ہو جاتا تھا۔ جانے میرے دل میں بچپن سے یہ بات کیوں بیٹھی گئی تھی کہ کھاتے ہوئے انسان کچھ معزز دکھائی نہ دیتا ہوگا۔ وہی مسئلہ اس وقت بھی درپیش تھا لیکن مولوی صاحب کے پُر خلوص اصرار کے سامنے میرے اندر کی اس ازلی کمزوری کی کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔ مجھے مجبوراً سب کچھ تھوڑا تھوڑا چکھنا پڑا۔ اور سچ یہ ہے کہ یہ جس کے ہاتھ کا بھی ہنر تھا۔ لا جواب تھا۔ میری زبان اس ذائقے کو کبھی نہیں بھلا پائے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ سب گھر ہی کا بنا ہوا تھا کیونکہ اتنی جلدی بازار سے یہ سب کچھ منگوانا اور یہ سب اہتمام ممکن نہیں تھا۔ لیکن یہ کون ہو سکتا تھا۔۔۔؟۔۔۔ گھر میں تین عورتیں موجود تھیں۔ مولوی صاحب کی بیوی اور ان کی دو بیٹیاں۔۔۔۔۔ کچھ نہ کچھ تو ضرور اس کے ہاتھ کا جادو بھی شامل ہوگا ان سب لوازمات میں۔۔۔۔۔ یہی سوچ کر میں ہر چیز اٹھا کر چکھتا رہا۔۔۔۔۔ اور پھر شاکر نے جیسے میرے دل کی آواز کو زبان دے دی۔ وہ مولوی صاحب کی طرف متوجہ ہوا۔ ”اب کیسی طبیعت ہے بھابھی کی مولوی صاحب۔۔۔۔۔ کمر کا درد کچھ کم ہوا یا نہیں۔“

مولوی صاحب پریشانی سے بولے، ”کہاں شاکر میاں۔۔۔۔۔ بڑھاپا خود ہی سب سے بڑی بیماری ہوتا ہے۔ اوپر سے یہ نت نئی بیماریاں۔۔۔۔۔ اب تو زیادہ تر آرام ہی کرتی ہیں۔ گھر کا سارا کام کاج بھی بچیوں نے ہی سنبھال رکھا ہے۔“

تو گویا میرا اندازہ درست تھا۔ یہ سب کچھ اسی عشوہ طراز کے ہاتھوں اور نگرانی کا کمال فن تھا۔

چائے پینے کے بعد شاکر نے میری طرف سے اجازت چاہی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں حسب معمول اور حسب عادت ان کی مہمان نوازی سے اکتا چکا ہوں گا۔ شاکر کے لیے تو یہ بات بھی باعث حیرت ہوگی، کہ میں اتنی دیر سے بنا کچھ کہے یہاں کیسے بیٹھا رہ گیا۔ جب کہ مجھے اس وقت یوں لگا کہ جیسے ابھی چند لمحے پہلے ہی تو ہم یہاں آئے تھے۔ ابھی تو میں نے کھل کر اس گھر کی فضا میں سانس بھی نہیں لیا تھا۔ آخر شاکر کو کس بات کی جلدی تھی؟ کچھ دیر تو اور بیٹھا رہتا۔ بہر حال اب تو تیر کمان سے نکل ہی چکا تھا۔ شاکر جانے کے لیے کھڑا ہو چکا تھا۔ مجبوراً مجھے بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ مولوی صاحب ہماری آمد پر نہایت ممنون تھے۔ نہ شکر یہ ادا کرتے کرتے ان کی آنکھیں ہی بھر آئیں۔ میں نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر

انہیں تسلی دی اور انہیں احساس دلایا کہ وہ ہم سب کے لیے کس قدر قابل احترام ہیں۔ ہم سب کمرے سے نکل کر صحن میں آ گئے۔ میرا دل جیسے کسی نے مٹھیوں میں پکڑ کر بھیج لیا ہو۔ ہم واپس جا رہے تھے۔ جانے پھر کبھی دوبارہ یہاں آنا ہو یا نہ ہو۔ کاش میں اس کی ایک جھلک دیکھ پاتا، کاش۔۔۔۔۔

اچانک چلتے چلتے شاکر صحن میں رک گیا اور اُس نے سنی کو آواز دی جو ابھی تک زنان خانے میں ہی تھا۔ بے اختیاری طور پر میری اور مولوی صاحب کی نگاہ بھی اسی طرف اٹھ گئی جہاں سے سنی کے قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہم سب ہی صحن میں رک گئے تھے۔ اور پھر اچانک ہی سنی دوڑتا ہوا اندر برآمدے سے برآمد ہوا۔ چند لمحے کو ککڑی کی جالیوں کے پرے دروازے پر ڈلی ہوئی ایک چلمن ذرا دیر کو ہٹی اور مجھے یوں لگا کہ جیسے میری تمام زندگی کا مقصد ہی آج پورا ہو گیا ہو۔ ہاں۔۔۔۔۔ وہ وہی تھی۔ دروازے کی اوٹ سے مسکراتے ہوئے سنی کو ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہتی ہوتی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی چھوٹی بہن اس سے چپکی کھڑی تھی۔ اور وہ بھی سنی کو دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی۔ یہ اوپر تلے والی بہنوں کا رشتہ بھی کتنا عجیب ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ دونوں کے بس جسم ہی علیحدہ ہیں، ورنہ دونوں کا ذہن اور دل ایک ہی ہے۔ ایک سا سوچنا، ایک سا بولنا، ایک سا پہننا۔۔۔۔۔ میں نے تو ایسی بہنیں بھی دیکھیں ہیں جو بیک وقت ایک ہی ہستی کی محبت میں مبتلا بھی رہی ہیں۔

اس نازنین کا یہ جلوہ بھی بس چند ساعتوں کا ہی تھا۔ جیسے ہی اُسے احساس ہوا کہ ہم صحن میں کھڑے سنی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ وہ فوراً گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ لیکن اسی سماعت قدرت مجھ پر شاید اپنی ہر مہربانی لٹانے پر تلی تھی۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے بھی اس کی نگاہ میری بے قرار نگاہوں سے ٹکرائی گئی۔ ایک لمحے میں چند چنگاریاں اٹھیں اور میرے پہلے سے تار تار ہوئے دامن کو جلا کر خاکستر کر گئیں۔ کیا کیا تھا اس ایک نظر میں۔۔۔۔۔؟ بیگانگی، ٹوف، شرم و حیا، اپنی لا پرواہی کی جھنجھلاہٹ۔۔۔۔۔ اور نہ جانے کیا کیا۔۔۔۔۔

دنیا میں شاعر اور ادیب بہت سے رشتوں کو بیان کرتے سنے گئے ہیں۔ لیکن نظر سے نظر کے رشتے کو اس وقت جتنی شدت سے میں بیان کر سکتا تھا یہ میں ہی جانتا تھا۔ زمانے بھر کی بے چیدیاں، کسک اور بے بسی میرے اس ایک پل کے نظر کے رشتے میں مقید تھی۔

پہلی جمعرات کو چاہے خود یا چاہے کسی اور کے ذریعے کچھ صدقہ اور نذر و نیاز وغیرہ دے دیا کریں۔ خود ان بزرگ نے کوئی نذرانہ قبول نہیں کیا۔ ایک آدھ ماہ تک تو امی کو یہ سب یاد رہا، پھر انہوں نے اپنی مصروفیات کی وجہ سے شاکر کی یہ ڈیوٹی لگا دی کہ وہ کچھ بانٹ دیا کرے۔ شاکر اب تک یہ ڈیوٹی نبھا رہا تھا۔ حالانکہ امی شاید میرے بچپن کی وہ بیماری بھول بھال چکی تھیں۔ البتہ مولوی صاحب کے گھر سے واپسی کے بعد میری جو حالت رہنے لگی تھی اس نے انہیں میرے بچپن کی بیماری کی یاد دلادی تھی۔ فوراً خالہ سے رابطہ کیا گیا اور خالہ نے فوراً ہی فون پر ہی تین چار تیر بھد ف نسخے تجویز کر دیے۔ لیکن میرے دل کی حالت کوئی نہیں جانتا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میری زندگی کی ہر خوشی، ہر حاصل کا محور صرف اور صرف ”ایمان“ بنتی جا رہی تھی۔

oo

ہم اس کے گھر سے تو باہر نکل آئے لیکن مجھے ایسا لگتا تھا کہ جیسے میں اپنی روح وہیں اس چلمن کے پیچھے کہیں چھوڑ آیا ہوں۔ سنی نہ جانے راستے بھر مجھے اور شاکر کو کون کون سے قصے سناتا رہا۔ لیکن میں سوائے ہوں ہاں کے اور کچھ جواب نہ دے پایا۔ ہم نے گھر والوں کے سامنے مولوی صاحب کے یہاں جانے کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ زندگی پھر سے اپنی ڈگر پر روانہ ہو گئی لیکن شاید میری زندگی کا زاویہ اسی دن سے مکمل بدل گیا تھا جس دن ہم مولوی صاحب کے گھر گئے تھے۔

میں گھنٹوں ایک ہی جگہ گرم سم بیٹھا رہتا تھا۔ لیکن مجھے پہروں کے ڈھلنے کا اک ذرا احساس بھی نہ ہوتا۔ دوستوں کی سنگت اور محفل چھوٹ گئی تھی اور مجھے سب کچھ ایک دم ہی بے معنی سا لگنے لگا تھا۔ میرے اندر کی اس تبدیلی کو سب گھر والوں نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ امی ایسے موقعوں پر فوراً ایلو پیتھی، پھر ہومیو پیتھی اور پھر روحانی علاج کی طرف متوجہ ہو جاتی تھیں۔ بابا نے حسب معمول ایک لمبی سی ہنکاری بھری اور مجھے آب و ہوا بدلنے کا مشورہ دے کر پھر سے اپنا پاپ پیٹے میں مشغول ہو گئے۔ عبرینہ بھابھی نے فوراً امی کو مشورہ دیا کہ ان کی چھوٹی بہن کا رشتہ میرے لیے مانگ لیا جائے کیونکہ میری تنہائی دور کرنے کا یہ واحد اور بہترین حل وہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ امی کو دے چکی تھیں۔

میرے ساتھ بچپن سے ایک اور مسئلہ بھی درپیش تھا۔ مسئلہ کیا تھا اک عجب معمہ ہی تھا۔ بچپن میں، میں مہینے کی ہر پہلی جمعرات کو شدید بخار میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ دنیا کے علاج کروائے گئے، زمانے بھر کے ڈاکٹر ز مجھے دیکھ گئے پر یہ بیماری کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ پھر میری چھٹی خالہ جو دوسرے شہر میں رہتی تھیں اور امی سے چھوٹی تھیں، انہوں نے امی کو کسی نظر اتارنے والے عامل سے ملنے کا کہا۔ ہمارے ماڈرن گھر میں بھلا ایسی دقیا نوی باتوں کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ کشن صاحب کو فوراً جلال آ گیا اور امی کو ٹھیک ٹھاک لیکچر سننے کو مل گیا۔ لیکن پھر خالہ خود ہی ہمارے گھر آدھمکیں اور بابا سے چھپ کر وہ مجھے اور امی کو کسی بزرگ کے پاس لے گئیں جنہوں نے بغور میرا معائنہ کیا اور امی کو بتایا کہ میں روحانی طور پر اندر سے بے حد کمزور ہوں لہذا مجھے ساری زندگی نظر بد کا خطرہ لاحق رہے گا۔ انہوں نے مجھ پر کچھ پڑھ کر دم کیا اور ایک کالا دھاگا مجھے گلے میں پہننے کے لیے دیا۔ ساتھ ہی امی کو تاکید کی کہ ہر مہینے کی

یہودی

ایک پُرانی کہاوت ہے ”جو یاری کرے گا، وہ شب بیداری بھی کرے گا۔“ سولدن میں میری یہ دوسری رات بھی شب بیداری کی نظر ہو گئی۔ صبح کا مران کسی ہڑتال کی وجہ سے فارغ تھا، لہذا اس نے مجھے یونیورسٹی کے گیٹ پر ڈراپ کر دیا۔ نوٹس بورڈ سے پتہ چلا کہ آج سر آ نرک ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ نئے آنے والے اسٹوڈنٹس سے ہال نمبر تین میں بذریعہ لیکچر خطاب کریں گے۔ سو سبھی نئے آنے والوں کا رخ ہال نمبر تین کی طرف ہی تھا۔

بچپن میں ایک ٹی وی سیریل ہم سب بچے بڑے شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ نام تھا ”آخری چٹان“ اس میں ایک یہودی کریکٹر کا نام ڈیوڈ تھا۔ بچپن سے میرے دل میں یہودی شخص کی یہی ایک شبیہ چھپ سی گئی تھی۔ جب کبھی کوئی کہیں سی یہودی کی بات کرتا تو وہی بچپن سے دل میں نقش ہوئی صورت نگاہوں کے سامنے آ جاتی تھی۔ جس دن سے مجھے پتہ چلا تھا کہ ہمارا ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ بھی ایک یہودی تھا تب سے اس کی بات کرتے وقت ایک مخصوص خلیے کا یہودی میری نظروں کے سامنے آ جاتا۔ دبلا پتلا سا، چہرے پر یہویوں کی خاص مشابہت والی داڑھی، سر پر چھوٹی سی سفید ٹوپی، لمبا سا چنڈ، تیز تیز آنکھیں گھمانے والا اور بہت تول کر بولنے والا تسبیح گھماتا شخص۔۔۔۔

لیکن سر آ نرک کو دیکھنے کے بعد میرے تخیلات کو بہت زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت ٹھیس ضرور لگی۔ یہ تو ایک ماڈرن خلیے کا شخص تھا۔ عمر بچاس سے اوپر، تن پر بہترین اور قیمتی سوٹ، آنکھوں پر نظر کا باریک سا چشمہ، بے حد نرم گفتار سا شخص۔ اس دن میرے ذہن میں سے میرے بچپن والی یہودی کی شبیہ نکل گئی اور اس کی جگہ اس نئی تصویر نے لے لی۔ البتہ ایک مماثلت ضرور تھی کہ سر آ نرک کے ہاتھ میں بھی ایک چھوٹی سی تسبیح موجود تھی جسے وہ شائد اپنی عادت کے مطابق کبھی ہاتھ میں گھماتے اور کبھی جیب میں ڈال رہے تھے۔ معاشیات کی اس

کلاس میں تقریباً پینتیس کے قریب طالب علم تھے جن میں لڑکوں سے زیادہ تعداد لڑکیوں کی تھی۔ ہر آنرک کے ابتدائی لیکن پُر اثر سے لیکچر کا آغاز ہوا۔ شروع میں انہوں نے اپنا تعارف کروایا اور پھر معاشیات سے متعلق چند بنیادی باتیں بتائیں۔ کچھ یونیورسٹی کے ڈسپلن کے بارے میں بیان کیا اور آخر میں ہم سب سے تعارف کروانے کو کہا۔ مجھے رول نمبر 17 الاٹ ہوا تھا اور اسی دن مجھے یہ بھی پتہ چلا تھا کہ اس پوری کلاس میں ایک نہیں ہی اکیلا مسلمان طالب علم ہوں۔ میں نے اپنی باری پر اٹھ کر جب اپنا نام پکارا اور مذہب اسلام بتایا تو مجھے محسوس ہوا کہ کچھ دیر کے لیے تمام کلاس پر سناٹا سا چھا گیا ہے۔ شائد یہ میرا وہم ہی ہو لیکن پھر سر آنرک نے مجھ سے میری پچھلی تعلیم اور ڈگریوں وغیرہ کا پوچھ کر سلسلہ آگے بڑھا دیا۔ آخر اسٹوڈنٹس کے تعارف کا سلسلہ ختم ہوا اور سر آنرک نے ان اختتامی جملوں کے ساتھ اپنا پہلا لیکچر ختم کیا۔

”مائی ڈیر اسٹوڈنٹس۔۔۔۔ ازل سے لے کر اب تک۔۔۔۔ اور پھر شائد ابد تک ہمیشہ دنیا کے اعلیٰ ترین نظریات کو اوسط درجے کے ذہنوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ یاد رکھیے۔۔۔۔ جس نے کبھی غلطی نہیں کی۔۔۔۔ اس نے کبھی کچھ نیا کرنے کی بھی کوشش نہیں کی ہوگی۔۔۔۔ اس لیے نظریہ بنانے اور نیا نظریہ پیش کرنے میں کبھی بخل سے کام نہ لیجئے گا، ہمیں غلطی اور اوسط درجے کے ان ذہنوں کی مخالفت کے ڈر سے بہت آگے نکلنا ہوگا۔ میں ایک بار پھر آپ سب کو اس ادارے میں خوش آمدید کہتا ہوں۔۔۔۔ کل سے ہم باقاعدہ کلاسز کا آغاز کریں گے، گڈ ڈے۔“

سر آنرک اسٹیج سے اتر کر چلے گئے۔ ساری کلاس نے ڈیسک بجا کر ان کی تقریر اور خیالات کا خیر مقدم کیا۔ سچ یہ ہے کہ سر آنرک کی باتوں نے مجھے بھی خاصا متاثر کیا تھا۔ مجھے کامران کی ان سے بچ کر رہنے کی بات یاد آ گئی اور میرے لبوں پر خود بخود ایک ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ کامران نے دوپہر کو واپسی پر مجھے پک کرنے کا کہا تھا اور ابھی اس کے آنے میں پورے دو گھنٹے باقی تھے۔ سو ہال سے باہر نکل کر میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ کس طرف کو نکلا جائے۔ پھر میری نظر دُور پڑے ان پیئرز پر گئی جو یونیورسٹی کے درمیان سے گزرتی نہر (جو کہ دریائے ٹیمز کی ہی ایک شاخ تھی) کے کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر لگائے

ہے۔ شاید کسی اور میں اسے اس قدر جھیلنے کی تاب بھی نہیں ہوتی۔ انسان خود ہی اپنا سب سے بڑا دوست اور سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے۔ باقی اس کی اپنی ذات سے باہر ہونے والی سبھی دوستیاں اور سبھی دشمنیاں عارضی اور ناپائیدار ہوتی ہیں۔“

جوزف غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا ”خود سے بہت ناراض لگتے ہو۔ یہ تلخی بلاوجہ تو ہو نہیں سکتی۔ لگتا ہے کوئی بھٹی تمہارے اندر سلگ رہی ہے۔“

میں نے باتوں کا رخ کسی اور طرف موڑنا چاہا۔ ”لیکن آپ۔۔۔ آپ نے نام کے علاوہ اپنا کوئی دوسرا تعارف نہیں کروایا۔“

جوزف نے گہری سی سانس لی۔ ”نام تو تمہیں بتا ہی چکا ہوں۔ یہیں اسی یونیورسٹی میں فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہوں۔“

میں نے جلدی سے معذرت پیش کی۔ ”معاف کیجئے۔۔۔ میں شاید کچھ زیادہ ہی بول گیا۔ آپ کا انداز دراصل اساتذہ والا نہیں ہے ورنہ میں اتنی بے تکلفی۔۔۔۔۔“

جوزف نے ہنس کر میری بات کاٹ دی۔ ”اس معذرت کی کوئی ضرورت نہیں۔ دراصل میں جان بوجھ کر یہاں کونو جوانوں کو پہلی دفعہ اپنا پورا تعارف نہیں کروانا۔ ایسا کرنے سے وہ مؤدب یا محتاط ہو جاتے ہیں اور میں ان میں گھلنے ملنے کا موقع کھودیتا ہوں۔ میں یہی چاہوں گا کہ ہم ہمیشہ اسی بے تکلفی سے ملتے اور بات کرتے رہیں۔ تم ایک مختلف نوجوان ہو۔ تم سے ملنا واقعی ایک انوکھا تجربہ ہے میرے لیے۔“ جوزف جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

”میری کلاس کا وقت ہو رہا ہے حماد۔ مجھے اُمید ہے بہت جلد ہماری ایک دوسری ملاقات ہوگی جو اس جیسی کئی ملاقاتوں کا ایک پیش خیمہ ثابت ہوگی۔“ جوزف گرجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ کچھ دیر میں کامران کے آنے کا بھی وقت ہو گیا۔ میں بھی سامنے بہتے شفاف پانی اور پرندوں سے رخصت لے کر یونیورسٹی کی لمبی لمبی راہداریوں سے ہوتا ہوا باہر گیٹ پر آ گیا۔ باہر کامران کی گاڑی پہلے سے موجود تھی۔ میں نے کامران کی ٹاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں، موصوف کچھ دور ایک پاپ کارن کی مشین کے قریب کھڑی دونو جوان میموں کا ہاتھ دیکھنے میں مصروف تھے اور انہیں یقین دلارہے تھے کہ بہت

گئے تھے۔ اس طرف آبی پرندوں کے غول بھی موجود تھے، جو اڑتے ہوئے آتے دریا کنارے بیٹھے اسٹاف اور دیگر طالب علموں کے ہاتھوں پھینکی گئی اپنی مخصوص خوراک کو چگتے اور پھراڑ جاتے۔ مجھے بھی یہی گوشہ تنہائی وقت گزاری کے لیے بہتر لگا اور میں انہی لکڑی کے بیچوں میں سے ایک پر جا کر بیٹھ گیا اور سامنے بہتے پانی اور ان پرندوں کی آپس میں ہوتی اٹھکیلیاں دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔

کچھ ہی دیر بعد ایک بوڑھا شخص سر پر ہیٹ پہنے، لمبے سے اوور کوٹ اور مفلر میں ملبوس آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس طرف آ پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں پرندوں کو ڈالنے والے ڈانے کا ایک بڑا سا کاغذی لفافہ پکڑا ہوا تھا۔ اس نے کچھ ہی دیر میں مٹھیاں بھر بھر کے دانے پرندوں کی طرف اچھال کر وہ لفافہ خالی کر دیا اور اسے قریب بنے ہوئے کوڑے دان میں ڈال کر وہ جانے کے لیے پلٹا۔ پھر اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور وہ میری طرف چلا آیا۔ اور ہاتھ بڑھا کر بولا۔

”جوزف۔۔۔ کیا تم نئے آنے والے طلباء میں سے ایک ہو۔“ میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ ”حماد۔۔۔ فرسٹ سیمسٹر۔۔۔ معاشیات۔“ اُس نے گرجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اور مسکرا کر بولا۔۔۔۔۔

”اوہ آئی سی۔۔۔ لیکن یگ مین۔ تم یہاں تنہا کیوں بیٹھے ہو۔۔۔ کیا سینئر اسٹوڈنٹس کی رینگ (Raging) سے ڈرتے ہو۔“

میں بھی مسکرا دیا۔ ”نہیں۔۔۔۔۔ مجھے ڈر صرف اپنے آپ سے لگتا ہے۔ لیکن اس وقت میں خود اپنے آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس طرف آ بیٹھا۔“ جوزف نے دلچسپی سے میری طرف دیکھا۔

”خوب۔۔۔۔۔ اپنے آپ سے باتیں۔۔۔۔۔ بھئی اس ملاقات کی طرف تو کبھی اپنا دھیان ہی نہیں گیا، خود سے خود کی ملاقات۔۔۔۔۔“

میں نے کھسک کر اس کے لیے تختے پر جگہ خالی کی، جوزف بیٹھ گیا۔ میں نے اُسے جواب دیا۔ ”اس ملاقات کے لیے کسی خاص توجہ کی کبھی ضرورت نہیں ہوتی۔ انسان عمر بھر میں اپنے آپ ہی سے سب سے زیادہ باتیں کرتا ہے اور اپنے آپ کو ہی سب سے زیادہ جھیلتا

جلد ان کی زندگی میں ایک خوبرو ایشیائی نو جوان آنے والا ہے جس کے آتے ہی ان کی زندگیوں میں انقلابی تبدیلیاں آجائیں گی۔ مجھے کامران کی اس صلاحیت پر ہمیشہ سے ہی رشک آتا تھا۔ مجھے کسی اجنبی لڑکی تو کیا، کسی اجنبی مرد سے بھی پہلی مرتبہ بات کرتے ہوئے ایک جھجک سی محسوس ہوتی تھی تاوقتیکہ وہ اجنبی خود ہی بات کرنے میں پہل نہ کر دے۔ جب کہ کامران راہ چلتے اُٹھتے بیٹھتے، سوتے کسی بھی وقت کسی کو بھی روک کر گھنٹوں باتیں کر سکتا تھا۔ شاید میرے اندر ٹھکرائے جانے کا ڈر ہمیشہ سے موجود رہا تھا اور کامران ایسے کسی خوف سے بالکل نا آشنا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے جلدی سے میری طرف ہاتھ ہلایا۔ ان گوری میمنوں کو اپنا کارڈ دیا۔ ان کے فون نمبرز لیے اور مسکراتے ہوئے میری طرف بڑھ آیا۔ ہم گاڑی میں سوار ہو گئے۔ میں نے کامران کو گھورا، ”تم کبھی نہیں سدھرو گے۔۔۔ ہے نا۔“

کامران ہنسا، ”ارے یار بور ہو رہا تھا پندرہ منٹ سے یونیورسٹی کے گیٹ پر کھڑا۔ سوچا ان کا ہاتھ ہی دیکھ لوں۔“

”جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ میں نے تمہاری پچھلی سات نسلوں میں کسی دست شناس کا تذکرہ تک نہیں سنا۔“

کامران کے ہونٹوں پر اب بھی وہی شریری مسکراہٹ تھی۔ ”جانے دے نایار۔۔۔۔۔ یہ بتاؤ کہ لنچ کا کیا پروگرام ہے۔ میرے پیٹ میں تو چوہے دوڑ رہے ہیں۔“ میں نے سیٹ بیلٹ کچھ ڈھیلی کی۔ ”ہوں۔۔۔۔۔ بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔ کہیں بھی لے چلو۔“

کامران نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ ”پکا ڈلی کی طرف چلتے ہیں۔ وہاں ایک نیا ریسٹورنٹ کھلا ہے۔ کافی تعریف سنی ہے۔“

ہماری گاڑی لندن کی دورویہ اور چار روہیہ بڑی بڑی شفاف سڑکوں سے ہوتی ہوئی بگ بین (Big Ben) کے سامنے سے دائیں کو مڑ گئی۔ لندن کے مشہور بُرجوں والے پُل سے ہوتے ہوئے ہم پکا ڈلی کی طرف مڑ گئے۔ مجھے لندن کی یہ چوڑی چوڑی سڑکیں ہمیشہ سے بہت بھلی لگتی تھیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں یورپین حکام نے عوام کی بغاوتوں اور بلبوں کو روکنے کی حکمت عملی کے طور پر ان تمام شاہراہوں کو چوڑا کر دیا تھا تا کہ حکومت اور فوج کا عملہ آسانی کے ساتھ جہوم کو ایک ہی

ہم۔ قابو میں رکھ سکے۔

پکا ڈلی سرکس سے بائیں مڑتے ہی دورویہ درختوں کی لمبی سی قطار سے ڈھکی ایک نماوش اور سنسان سی سڑک شروع ہو گئی۔ سڑک کے کنارے بنی ہوئی چوڑی سی نالی میں ہمستہ ہوئی برف کا پانی ایک انجانے سے سر کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ میں اور کامران اس سڑک پر مڑتے ہی ایک دم سے خاموش ہو گئے۔ جیسے قدرت کی اس بے پناہ خوبصورتی نے ہماری زبانیں ہی سلب کر لی ہوں۔ سڑک پر درختوں سے گرے ہوئے سرخ اور زرد پتوں کی چادری بچھی ہوئی تھی۔ جو زور کی ہوا چلنے سے اس بھیگی ہوئی سڑک پر کچھ اس طرح سے لہراتے تھے جیسے کوئی ریشمی کپڑا بچھائے کوئی کابلی پٹھان بیٹھا ہو، جو اپنی گٹھڑی سے رنگ برنگے نئے تھان نکال کر ہوا میں لہرا رہا ہو۔

کبھی کبھی ہم چند پلوں میں ہی اپنی ساری زندگی پھر سے جی لیتے ہیں، درختوں اور ان سے خزاں رسیدہ پتوں سے گھری ہوئی اس سڑک پر ہم دونوں کا یہ سفر بھی زندگی کے انہی چند ہاں میں سے ایک تھا۔ کچھ دیر کے لیے تو ہم یہ بھول ہی گئے تھے کہ ہم اس سڑک کے اختتام پر بنے ایک نئے ریسٹورنٹ میں لنچ کرنے کے لیے نکلے تھے۔

بالآخر دنیا کی ہر اچھی چیز کی طرح اس سڑک کا بھی اختتام ہو ہی گیا۔ ہم نے لکڑی کے بنے ہوئے اس چھوٹے سے خوبصورت ریسٹورنٹ میں اپنی پسند کا لنچ کیا۔ کامران مجھ سے یونیورسٹی کے بارے میں پوچھتا رہا اور میں نے اُسے سر آئزک کے لیکچر اور اپنے تعارف پر کامران کی خاموشی کے بارے میں بتایا۔ کامران ایسے موقعوں پر بالکل پینڈو ہو جاتا تھا۔ اسے اپنے غصے پر بالکل کنٹرول نہیں رہتا تھا۔ اس نے زور سے گلاس میز پر مارا۔۔۔۔۔ ”یہ سالے گورے کہیں کے۔۔۔۔۔ ان کی تو۔۔۔۔۔ بڑی مشکل سے میں نے اُسے قابو کیا۔ کامران کا موڈ اب بھی خراب تھا۔ میں نے اسے موڈ میں لانے کے لیے ایک لطیفہ سنایا۔۔۔۔۔ ”ایک گوری میم پر کسی کتے نے کانٹے کے لیے حملہ کر دیا۔ پاس سے گزرتے ایک شخص نے ہان پر کھیل کر اس کتے سے میم کی جان بچائی۔ اگلے دن کے اخباروں میں کتے سے میم کو پاتے ہوئے اس شخص کی تصویر چھپی اور بیڈ لائن لگی۔“ انگلش ہیرو نے عورت کو کتے سے بچا لیا۔“

اس شخص نے اخبار کے دفتر فون کر کے کہا، ”میں انگریز نہیں ہوں۔“ دوسرے دن اخبار نے پھر سرخی لگائی ”غیر ملکی بیرو نے عورت کو جان پر کھیل کر کتے سے بچایا۔“ اس شخص نے پھر اخبار کے دفتر فون کیا اور بتایا کہ میں غیر ملکی نہیں، ”پاکستانی اور مسلمان ہوں۔“ تیسرے دن اخبار نے اسی تصویر کے نیچے یہ سرخی لگائی، ”خطرناک دہشت گرد نے پالتو کتے پر حملہ کر دیا۔“۔۔۔۔۔

کچھ دیر تک تو کامران حیرت سے میری طرف دیکھتا رہا، پھر ہم دونوں کے منہ سے بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔ وہ چھوٹا سا ریسٹورنٹ ہمارے قہقہوں سے گونج رہا تھا اور آس پاس کے لوگ ہمیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

oo

گھائل

بچپن میں جب کبھی مجھے کھیلتے ہوئے دوڑ بھاگ میں کوئی چوٹ لگ جاتی تھی تو میں کبھی دوسروں کے سامنے نہیں روتا تھا نہ شدید سے شدید درد میں بھی میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ لوگوں کے سامنے میرے آنسو نہ نکلیں۔ ایسی صورت میں میں فوراً کسی گوشہ تنہائی کی طرف بھاگتا اور وہاں دل کھول کر روتا۔ دراصل مجھے بچپن سے ہی سب کے سامنے رونا بہت میوہ لگتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ ہم دوسروں کے سامنے رو کر اپنی عزت ان کی نظروں میں کھو دیتے ہیں۔

مولوی صاحب کے گھر سے واپسی کے بعد بھی میری حالت کچھ ایسی ہی تھی۔ رونا چاہتا تھا لیکن رونے کے لیے جگہ میسر نہ تھی۔ عجیب بے بسی تھی۔

مولوی صاحب صحت یاب ہونے کے بعد دوبارہ سے سنی کو درس دینے کے لیے آنے لگے تھے۔ ان دنوں میں کسی بھی بہانے سے سنی اور مولوی صاحب کے آس پاس ہی چکر کاٹتا رہتا تھا۔ اس اُمید میں کہ شاید سنی ان سے ایمان کی کوئی بات کرے۔۔۔ یا پھر مولوی صاحب ہی اپنے گھر کا کوئی تذکرہ چھیڑ دیں۔ لیکن میری یہ اُمید بھی ہمیشہ ٹوٹی ہی رہی۔

پھر میرے جنوں نے ایک اور روپ دھارا۔ میں مولوی صاحب کے آنے کے انتظار میں رہتا اور جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوتے میں گاڑی نکال کر ان کے محلے کے گیٹ کے سامنے اور کبھی کبھار تو بالکل ہی ان کی گلی کے پاس لے جا کر گاڑی لگا دیتا اور مولوی صاحب کے واپسی تک گاڑی میں ہی بیٹھا ٹنگی لگائے اس تازمین کی راہ نکلتا رہتا۔ اس اُمید پر کہ کبھی نہ کبھی تو وہ گھر سے باہر نکلے گی۔ لیکن یہ حسرت بھی ہمیشہ ناکام ہی رہی۔ میں نے کبھی کسی کو اس گھر سے باہر نکلتے نہیں دیکھا۔ ہاں البتہ آس پاس سے گزرتے محلے کے مکین میری گاڑی سے اچھی طرح سے واقف ہو چکے تھے۔ البتہ ان میں سے کسی نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ وہ

بابا کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے، جوان کے پاپ کے دھویں کے پیچھے کھو گئے۔ امی اور بھابھی نے بھی ناک بھوں چڑھائی لیکن کسی نے کچھ کہا نہیں۔ یہ سچ ہے کہ اس مرتبہ شاکر کی خوشی میں شرکت کرنے میں میری اپنی شدید غرض بھی شامل تھی، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اگر بات ایمان کی ایک جھلک کی نہ بھی ہوتی تو میں ضرور شاکر کے گھر جاتا۔ اس کا اور میرا رشتہ نوکر اور مالک سے بہت بڑھ کر تھا اور تمام گھروالے بھی بچپن سے میری شاکر سے اس انسیت سے اچھی طرح واقف تھے۔

شاکر بہت پہلے مولوی صاحب کے اس چھوٹے سے محلے میں ہی رہتا تھا، اُسے بہت چھوٹی عمر میں دادا جان نے گھر کی ڈرائیوری پر رکھ لیا تھا۔ بابا کی شادی بھی اس کے سامنے ہی ہوئی تھی۔ بعد میں کچھ سالوں کے بعد شاکر کی بھی شادی ہو گئی تو دادا نے ان دونوں میاں بیوی کو اپنے بنگلے کے پیچھے بنے سروٹ کو ارٹرز میں رہنے کی جگہ دے دی۔ سروٹ کو ارٹرز کیا تھے اچھے خاصے بڑے مکان تھے جو ہماری پُرانی حویلی کے پچھواڑے بنے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں دادا جان کے ہاں ان کے گاؤں کے رشتے داروں کا بہت آنا جانا تھا۔ سوانہوں نے پچھلے حصے میں یہ تین چار کو ارٹرز ڈلوالے تھے۔

دادا کی وفات کے بعد بابا نے اپنی کمشنری کے تقاضوں کے مطابق اس جدید علاقے میں یہ کٹھی بنوالی تھی۔ البتہ ہماری پُرانی حویلی شہر کے مضافات میں اب بھی موجود تھی۔ شاکر اور اس کا خاندان ہی اب بھی اس حویلی کی رکھوالی کرتا تھا اور ان کی رہائش اب بھی وہیں تھی۔ شاکر کی اولاد میں دو بیٹے اور ایک چھوٹی بیٹی شامل تھی۔ دونوں بیٹے محنت مزدوری کے سلسلے میں شہر سے زیادہ تر باہر ہی رہتے تھے۔ بابا کی خاص دعوتیں اور اجلاس وغیرہ اب بھی اسی حویلی میں ہی منعقد کیے جاتے تھے۔ بلکہ آج کل تو بابا اس پُرانی حویلی کو اپنا کمپ آفس بنانے کا سوچ رہے تھے۔

شاکر تو اپنی بیٹی کی منگنی کا نیو تارے کر واپس چلا گیا تھا لیکن اب میرے لیے ایک ایک ہلکا سا کس قدر دشوار تھا۔ یہ بس میں ہی جانتا تھا۔ دن پہر گھنٹے اور لمحے۔۔۔ مجھے اس قدر ملوئل کبھی محسوس نہیں ہوئے تھے جتنے ان چار دنوں میں، آخر خدا خدا کر کے جمعے کا دن بھی آ ہی گیا۔

مولوی صاحب کے گھر کئی مرتبہ شاکر کو ایسی بڑی گاڑیوں میں آتا جاتا دیکھ چکے تھے۔ لہذا انہوں نے اسے بھی کچھ اسی طرح سے تعبیر کیا ہوگا۔ البتہ یہ خیریت رہی کہ ان میں سے کسی نے کبھی مولوی صاحب سے تذکرہ نہ کیا۔ ورنہ میرے لیے جواب دینا بہت مشکل ہو جاتا۔ دن یونہی گزرتے جا رہے تھے اور میرا جنون بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ پھر جیسے قدرت کو مجھ پر رحم آ ہی گیا۔ ایک ایسی ہی گرم سہ پہر کو جب مولوی صاحب سنی کو درس دے رہے تھے۔ شاکر انہیں ڈھونڈتا ہوا اسی گول کمرے کی طرف آنکلا جہاں میں بھی یونہی بلا وجہ بیٹھا کب سے رسالے کے ایک ہی صفحے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ شاکر نے آتے ہی مولوی صاحب کو یہ مشرکہ سنایا کہ اس کی بڑی بیٹی کی منگنی طے ہو گئی ہے اور اگلے جمعے کی سہ پہر مولوی صاحب بمع خاندان کے اس کے گھر مدعو ہیں۔ مولوی صاحب نے منگنی طے ہونے پر شاکر کو بے حد مبارک باد دی اور خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن انہوں نے شاکر سے معذرت کی کہ جمعے کے دن کا تو وہ پہلے ہی کسی تبلیغی جماعت سے وعدہ کر چکے ہیں کہ ان کے ساتھ علاقے کے گشت پر چلیں گے اور اب اس وعدے کو ٹالنا کسی طور مناسب نہ تھا۔ البتہ انہوں نے یہ وعدہ ضرور کیا کہ وہ اپنے بھتیجے عبداللہ کے ساتھ باقی گھر والوں کو منگنی کی تقریب میں ضرور بھیج دیں گے۔ مجھے یوں لگا جیسے برسوں کی ویران بیابان صحرا میں پھرتے پھرتے اچانک کوئی نخلستان دور سے مجھے نظر آ گیا ہو۔ میں جانتا تھا کہ شاکر یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمارے اس امارت زدہ گھر میں سے کوئی بھی اس کی اس خوشی میں شریک ہونے نہیں آئے گا، ہم سب کو دعوت ضرور دے گا۔ شاید قدرت نے مجھے اس کی ایک جھلک دکھانے کے لیے ہی یہ سب انتظام کیا ہو اور پھر ہوا بھی یونہی۔ بابا نے حسب معمول ایک لمبا سا ہنکارا بھرا، اور جیب سے پرس نکال کر چند بڑے نوٹ شاکر کے حوالے کر دیے۔

”میری طرف سے بیٹی کے لیے کچھ لے لینا۔“

امی نے بھی گھر میں کام کرنے والیوں کو پُرانے صندوق اور الماریاں کھنگالنے کا کہا اور کپڑوں اور پُرانے زیورات کی ایک گنہزی شاکر کے حوالے کر دی گئی، شاکر نے سب کی طرف سے مایوس ہو کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔

”میں ضرور آ جاؤں گا۔ وعدہ رہا۔“

ایک ٹانگہ اپنی مخصوص ٹک ٹک کی آواز کے ساتھ نمودار ہوا۔ میری نظریں آخری امید کے ٹٹماتے دیے کی طرح اس ٹانگے کی مخصوص رفتار پر جمی گئیں۔ ٹانگہ حویلی کے بڑے چوبی گیٹ کے سامنے آ کر رک گیا۔ اس میں اگلی سیٹ پر کوچوان کے ساتھ ایک پُر نور چہرے اور ہلکی سی داڑھی والا ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ سفید شلوار کرتے میں ملبوس اس نوجوان نے اتر کر کوچوان کو کرایہ دے کر فارغ کیا اور پچھلی سیٹ سے سیاہ برقعوں میں ملبوس دو لڑکیاں نیچے اتریں۔ فضا تھم سی گئی، ہوا ساکت ہو گئی اور درختوں کے سبھی پرندے چپھانا بھول گئے۔ وہ ایسی تھی۔ میں ان نازک قدموں کو بھلا کیسے بھول سکتا تھا۔ اس کے ساتھ یقیناً اس کی چھوٹی بہن تھی۔ دونوں لڑکیوں کی صرف آنکھیں نقاب سے باہر تھیں۔ اف۔۔۔۔۔ پھر وہی آنکھیں۔۔۔۔۔ اس نوجوان نے حیرت سے پہلے اس عظیم الشان حویلی کو دیکھا اور پھر لڑکیوں سے جیسے ایک مرتبہ دوبارہ تصحیح چاہی کیونکہ ایک ڈرائیور کی ایسی رہائش گاہ کا اسے تصور بھی نہ ہوگا۔ پھر شاید جیسے چھوٹی والی نے اُسے کچھ سمجھایا۔ وہ نوجوان انہیں لیے جیسے کسی شش دانج میں جھمکتے ہوئے گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا۔ شاید وہ سب پہلی مرتبہ شاکر کے گھر آئے تھے۔

دفعۃً اس نوجوان کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اور یہ کیا؟ وہ تینوں تو میری جانب ہی بڑھ رہے تھے۔ میں ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ چھوٹی والی کی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر شناسائی کی ایک چمک لہرائی اور اس نے سرگوشی میں ایمان سے کچھ کہا۔ شاید چھوٹی مجھے پہچان گئی تھی۔ ایمان نے ایک نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ایک بجلی سی چمکی۔۔۔۔۔ یہ اس کی دوسری نظر تھی جو میری فکر سے ٹکرائی تھی۔ بے خودی کی ایک لہر مجھ پر طاری ہو گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی پہلی نظر سے لے کر اس دوسری نظر تک کے فاصلے کے درمیان مجھ پر جو بھی گزری، میری تڑپ، میری لک، میری وحشت اور میری دربدری۔۔۔۔۔ سب کو قرار مل گیا ہو۔

میرے قریب آ کر لڑکے نے مجھے سلام کیا۔ ”جناب۔۔۔۔۔ یہ شاکر صاحب۔۔۔۔۔“

امطلب ہے جن کی بیٹی کی آج مگنی ہے، اُن کا گھر۔۔۔۔۔؟“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”جی جی۔۔۔۔۔ آپ ٹھیک جگہ پر آئے ہیں۔ یہاں ہے اس

ا سے ہوتے ہوئے آپ پیچھے چلے جائیے۔ قریب وہیں ہو رہی ہے۔“

مجھے یاد ہے اس دن میرا دل کر رہا تھا کہ صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی میں پُرانی حویلی کے گیٹ سے ملحق باغ میں جا بیٹھوں جہاں سے تمام مہمانوں کو داخل ہونا تھا۔ وہ بھی تو وہیں سے گزرے گی۔ جانے وہ کیسا لمحہ ہوگا جب میں پھر اُسے ایک مرتبہ دیکھ پاؤں گا۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ تقریب کا وقت شام 4 بجے کا رکھا گیا تھا اور ابھی تک تو ٹھیک سے صبح بھی نہیں ہوئی تھی۔

میں سہ پہر تک کسی کھوئے ہوئے مسافر کی طرح اپنے ہی گھر کی راہداریوں میں اور روشوں میں کئی پتنگ کی مانند دلتا رہا۔ اس دن مجھے پتہ چلا کہ لمحے گھنٹوں کی طرح کیسے گزرتے ہیں۔ نہ جانے کب دن کے دو بجے اور میں اس بچے کی طرح گاڑی نکال کر اپنی پُرانی حویلی کی طرف بھاگا جو اپنے روزے کے دن عصر کے وقت سے ہی روزہ کھانے کے انتظار میں دسترخوان پر جا بیٹھتا ہے۔

شاکر مجھے اس قدر جلدی وہاں پا کر بے حد خوش اور کچھ پریشان بھی ہوا۔ کیونکہ ابھی تک تو وہ اور اس کے بیٹے انتظامات میں ہی مشغول تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے شاکر کو اس بات پر راضی کیا کہ وہ میری فکر چھوڑ دے۔ وہ اپنے کام جاری رکھے۔ تب تک میں حویلی کا ایک چکر لگا لوں گا۔ شاکر کو دکھانے کے لیے کچھ دیر تک میں اپنی آبائی حویلی میں گھومتا پھرتا رہا اور جیسے ہی شاکر کا دھیان دوسری طرف ہوا میں نظر بچا کر گیٹ کے پاس والے باغیچے میں لگی کرسیوں میں سے ایک پر آ بیٹھا۔ تمام مہمانوں کو اسی مرکزی گیٹ سے ہی اندر آنا تھا کیونکہ شاکر کے کوارٹر کے لیے حویلی میں دوسرا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ ساڑھے تین بجے سے مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی اور میری دھڑکن کی اتھل پتھل بھی۔۔۔۔۔ جب بھی کوئی پردہ نشیں دور سے گیٹ کی طرف آتی نظر آتی۔ میری سانسیں تھمنے لگ جاتیں۔ لیکن جس کے انتظار میں میں جانے کتنی صدیوں سے یہاں بیٹھا تھا اس کا اب تک دور دور تک کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ مجھے لگا کہ جیسے وہ نہیں آئے گی۔ کہیں مولوی صاحب نے ہی منع نہ کر دیا ہو؟ کہیں کوئی اور مسئلہ نہ ہو گیا ہو؟ ہزار دسو سے تھے جو ایک ایک پل میں دل میں آتے اور میری وحشت کو بڑھا کر واپس چلے جاتے۔

پھر اچانک اس ٹھنڈی سڑک کے موڑ سے، جس کے کنارے ہماری حویلی موجود تھی۔

ضد کے سامنے اُسے ہمیشہ ہی بار ماننا پڑی تھی، اسے بڑے ہال کو اب مردانے کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ اور اس ہال کے پچھلے دروازے کے بالکل سامنے شاکر کے کوارٹر کا چھوٹا سا باغیچہ اور اس کے پیچھے شاکر کا گھر تھا، جیسے ہی میں ہال سے باہر نکلا وہی نوجوان جو ایمان اور حیا کے ساتھ آیا تھا۔ کچھ مضطرب سا مجھے ہال کے دروازے کے باہر کھڑا نظر آیا۔ مجھے دیکھ کر وہ جلدی سے میری طرف بڑھا۔ ”معاف کیجئے۔۔۔۔۔ میں اس وقت آپ کو پہچان نہیں پایا۔۔۔۔۔ میرا نام عبداللہ ہے۔ میں مولوی علیم الدین صاحب کا بھتیجا ہوں چچا اکثر آپ کی باتیں کرتے ہیں۔“

خوشگوار کی ایک لہری میرے تمام وجود میں پھیل گئی، تو گویا کسی بہانے ہی سہی۔۔۔۔۔ میرا ذکر نا چیز بھی اس چار دیواری میں ہوتا تھا۔ ہو سکتا ہے کبھی میرا نام اس مہ جیس کے ہونٹوں پر بھی آیا ہو۔ اُس وقت جانے کیوں، زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے نام پر خود بخود پیار آنے لگا۔ میں نے اس سے دوبارہ ہاتھ ملایا۔

”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی اس دن آپ کے گھر آنا ہوا تھا لیکن آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی لیکن آپ یہاں باہر کیوں کھڑے ہیں۔ اندر چلیے۔ کچھ ہی دیر میں چائے کا اہتمام ہونے والا ہے۔“

عبداللہ نے کچھ تذبذب سے کہا، ”در اصل مغرب کا وقت ہونے والا ہے۔ آپ تو چچا کی طبیعت سے واقف ہیں۔ ہمیں اب نکلنا چاہیے۔ میں اس انتظار میں یہاں کھڑا ہوں کہ اندر سے کسی کو بھیج کر گھر کی خواتین کو بلوالوں تو چلوں۔“

اتنے میں شاکر اندر زنانے سے برآمد ہوا۔ ہم دونوں کو باہر کھڑا دیکھ کر وہ جلدی سے ہماری طرف بڑھا۔۔۔۔۔ ”حماد بابا۔۔۔۔۔ خیر تو ہے۔۔۔۔۔ آپ باہر کیوں کھڑے ہیں۔“ میں نے مسکرا کر اُسے عبداللہ کی طرف متوجہ کیا۔

”میری طرف سے تو سب خیر ہی ہے۔ لیکن عبداللہ میاں واپسی کی فکر میں ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ دیر ہو رہی ہے۔“

شاکر نے حیرت اور کچھ شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

”ابھی سے۔۔۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔۔۔ ابھی تو انگوٹھی بھی نہیں پہنائی گئی۔ اور پھر مغرب

اُڑکا میرا شکر یہ ادا کر کے اور ہاتھ ملا کر انہیں لیے آگے بڑھ گیا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی ایمان کی طرف براہ راست دیکھنے سے روک رکھا۔ لیکن نہ دیکھنے کے باوجود اس کے قرب کا ایک عجیب اور لطیف سا احساس میرے ساتھ رہا۔ چھوٹی والی ایمان البتہ کچھ چلبلی سی لگتی تھی۔ وہ جاتے ہوئے پھر سے مجھے غور سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ یوں لگا جیسے زندگی پھر سے حرکت میں آگئی ہو۔ ہوا پھر سے چلنے لگی، پرندے پھر سے چہچہانے لگے۔ میں وہیں کرسی پر نڈھال ہو کر جیسے گرسا گیا۔ زندگی میں چند لمحے ایسے ہوتے ہیں جنہیں ہم بار بار جینا چاہتے ہیں۔ یہ بل میری زندگی کے انہی چند لمحوں میں سے ایک تھا۔ لیکن افسوس ہر نئی بات کی طرح ہر اچھی بات بھی گزرنے کے بعد صرف ایک یاد بن کر رہ جاتی ہے۔ میں کافی دیر وہیں بیٹھا خود کو یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا کہ یہ سب خواب نہیں تھا اور ابھی ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ یہیں موجود تھی۔ میرے سامنے، میرے اتنے قریب۔

اندر سے عورتوں کے ہنسنے بولنے اور گانے بجانے کی آوازیں آنے لگی تھیں اور پھر اندر سے شاکر مجھے ڈھونڈتے ہوئے اس طرف آ نکلا۔

”ارے حماد بابا۔۔۔۔۔ آپ ادھر بیٹھے ہیں۔۔۔۔۔ وہاں تقریب میں سبھی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آئیے نا۔۔۔۔۔“

شاکر زبردستی میرا ہاتھ تھام کر مجھے اندر مردانے میں لے گیا۔ وہاں سبھی مجھے دیکھ کر مؤدب سے ہو گئے اور ان کا ہنسا بولنا اور باتیں سرگوشیوں میں بدل گئیں۔ میں اسی لیے اس ہجوم میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی آپ کا اپنا تعارف ہی آپ کے لیے سب سے بڑا روگ بن جاتا ہے۔ یہاں پر سب مجھے شاکر کے مہمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ریٹائرڈ کمشنر امجد رضا کے بیٹے کی حیثیت سے پہچان رہے تھے۔ لہذا میں جلد ہی اس محفل سے اکتا گیا، ویسے بھی میرا دھیان ہی کہاں تھا ان سب باتوں کی طرف۔ پھر شاکر کو اندر کسی نے زنانے میں بلوا لیا اور مجھے وہاں سے باہر نکلنے کا موقع مل گیا۔ میں نے شاکر کو خصوصی تاکید کی تھی کہ مہمانوں کو بٹھانے کا اور ان کے طعام کا انتظام کھلی جگہ پر کرے، اس مقصد کے لیے میں نے اصرار کے اُسے حویلی کا بڑا ہال بھی استعمال کرنے کا کہا تھا۔ اُسے بابا کی ناراضگی کا ڈر تھا لیکن میری